بیادگار

محبوب العلماء والصلحاء

حضرت اقدس مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد

نقشبندی مجددی قدس سرہ

قرآن وسنّت اور روایاتِ اسلافِ اُمّت کے آئینہ میں
راہِ تصوّف وسلوک کا قلمی ترجمان!

ماہنامہ

فیضانِ نقشبند

جلد (۱) شمارہ (۵) بابت ماہِ اگست ۲۰۲۶ء

مُدیر

مفتی سیّد احمد اللہ غوری نقشبندی مجدّدی

خانقاہ نقشبندیہ مجدّدیہ اورنگ آباد

www.ilmozikr.com

کائناتِ انسانی کی کامل ترین زندگی...!

محبوب العلماء والصلحاء
حضرت اقدس مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی مجددی قدس سرہ

نبی علیہ السلام کی مبارک زندگی ایسی کامل اور مکمل زندگی ہے کہ تاریخِ انسانیت میں ایسی کامل زندگی نہیں مل سکتی۔ آپ ذرا بڑے بڑے سائنسدانوں کی زندگی کے متعلق پڑھ کر دیکھیں، لوگ ان کی تعریفیں کرتے ہیں کہ نیوٹن نے یہ کارنامہ سرانجام دیا، آئن سٹائن نے فلاں میدان میں اپنی عظمت کا لوہا منوایا اور فلاں نے یہ کر دیا، مگر زندگی نے وفا نہ کی، اگر زندہ رہتا تو کچھ اور بھی کر دکھاتا۔۔۔کیا مطلب؟۔۔۔مطلب یہ کہ اس کی زندگی ادھوری تھی۔ وقت کے بڑے سے بڑے جرنیل کو دیکھیں، لوگ اس کی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے فتوحات کیں، لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی، اگر کچھ عرصہ اور زندہ رہتا تو کچھ اور علاقوں پر بھی قبضہ کر لیتا۔ یعنی اس کی زندگی بھی ادھوری ہے۔ اسی طرح آپ جس کی زندگی کے بارے میں پڑھ کے دیکھیں آپ کو وہ ادھوری نظر آئے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی وہ کام نہ کر سکے جس کی وہ تمنا رکھتے تھے، لیکن تاریخِ انسانیت میں صرف ایک مثال ایسی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک شخصیت ایسی بھی تھی جس کی زندگی کامل اور مکمل تھی۔ اللہ رب العزت کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع میں علی الاعلان فرماتے ہیں: ''لوگو! جس مقصد کے لیے میں دنیا میں آیا تھا کیا میں نے وہ مقصد پورا کر دیا؟ کیا میں نے تم تک وہ پیغام پہنچا دیا ہے؟'' اس کے جواب میں پورا مجمع گواہی دیتا ہے کہ آپ نے اس امانت کو پہنچانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس وقت اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ رب العزت کو گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ اے اللہ! تو اس بات پر گواہ رہنا کہ میں نے اپنی زندگی کا مقصد پورا کر دیا ہے۔ (بخاری، حدیث: ۱۷۴۱)

(بیاناتِ سیرت، ج:۱، ص:۱۷۲)

قرآن وسنّت اور روایاتِ اسلافِ اُمّت کے آئینہ میں
راہِ تصوّف وسلوک کا قلمی ترجمان!

ماہنامہ

فیضانِ نقشبند

جلد(۱) شمارہ(۵) بابت ماہِ اگست ۲۰۲۶ء

Volume No.: 1 Issue No.: 5 August 2026

مُدیر

مفتی سیّد احمد اللہ غوری نقشبندی مجدّدی

مجلس ادارت

مفتی سیف اللہ قاسمی رائے چوٹی

مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی

مولانا محمد عمر قاسمی کاماریڈی

خانقاہ نقشبندیہ مجدّدیہ اورنگ آباد

www.ilmozikr.com

اَہم وضاحت

''ماہنامہ فیضانِ نقشبند کے تمام مضامین دراصل حضرت مدیر محترم مدظلہ کے مختلف بیانات اور دروس کی تحریری ترتیب ہے۔'' (ادارہ)

فہرستِ مضامین

قندیل ربانی (درسِ قرآن عظیم الشان)	دورنگی چھوڑ دے، یک رنگ ہوجا	وترتیب: مولانا محمد عمر قاسمی کاماریڈی	۳
نورِ نبوت (درسِ حدیث شریف)	صبر: حقیقت، فضائل اور انعامات	ضبط وترتیب: مفتی سید عبدالرافع قاسمی	۹
سخن اوّلیں	سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہماری عملی زندگی	مدیرِ محترم	۱۶
اکابر شناسی	خداوندا! مقصود من توئی و رضائے تو	ابوسیّد محمد اللہ غوری نقشبندی مجددی	۲۱
تعارفِ کتب تصوّف	مہلک روحانی امراض	مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی	۳۵
خطوط ہائے معرفت	درسِ قصدُ السبیل	مفتی احمد اللہ غوری نقشبندی مجددی	۴۹
سلوک کی ڈاک	ہدایۃ السالکین	ضبط وترتیب: مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی	۶۲
اصلاحی وتربیتی منظوم کلام	مناجات	از: حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ	۶۵

قندیلِ ربّانی

(درسِ قرآن عظیم الشان)

دورنگی چھوڑ دے، یک رنگ ہوجا

ضبط وترتیب: مولانا محمد عمر قاسمی کاماریڈی

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (سورۃ الصّف، آیت: ۲، ۳)

ترجمہ: ”اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ پاک کے نزدیک یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔“ (بیان القرآن)

تشریح:

اسلام وہ دینِ فطرت ہے جو انسان کو ایسا باخدا اور مردِ باصفا بنانا چاہتا ہے جس کا ظاہر اس کے باطن کا سچا آئینہ دار ہو۔ چناں چہ کسی بھی طرح کی دورنگی، گفتار و کردار کے تضاد اور ظاہر و باطن کے اختلاف کی اسلام میں مطلقاً گنجائش نہیں ہے؛ اس لیے کہ جہاں قول و عمل کا تال میل ٹوٹتا ہے، وہیں سے نفاق کی تاریک راہیں پھوٹتی ہیں۔

نفاق ایک ایسی خطرناک چیز ہے، جس کی برائی قرآن کریم نے مختلف مقامات پر بیان فرمائی ہے۔ اوپر جو آیاتِ کریمہ مذکور ہیں، ان کے شانِ نزول کے سلسلے میں روایات میں وارد ہے کہ ”کچھ مسلمانوں نے مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر یہ عہد کیا تھا کہ اگر ہمیں معلوم ہوجائے کہ اللہ پاک کو سب سے زیادہ کون سا عمل پسند ہے، تو ہم اس کے لیے اپنی جانوں کی بازی لگادیں گے۔ لیکن جب آزمائش کی گھڑی آئی اور معرکۂ احد کا مرحلہ پیش آیا تو بعض

استاذ ابوہریرہ اکیڈمی، اورنگ آباد (آن لائن)

حضرات اپنے کیے ہوئے عہد پر قائم نہ رہ سکے۔(تفسیر ہدایت القرآن، ج:۸،ص:۲۵۹)

چناں چہ باری تعالیٰ نے اسی پر گرفت فرمائی اور تنبیہ کی کہ ایمان محض دعوؤں کا نام نہیں؛ بلکہ عملی مواقع پر ثابت قدم رہنے کا نام ہے۔آدمی کو ایسی بات کا عہد ہی نہیں کرنا چاہیے جسے پورا کرنے کا اس میں حوصلہ نہ ہو؛ کیوں کہ خالقِ کائنات کے ہاں یہ طرزِ عمل شدید ترین ناراضی کا باعث ہے۔

اس آیتِ کریمہ سے ایک رہنمائی یہ بھی ملتی ہے کہ داعیانہ کردار میں عمل کی بڑی اہمیت ہے، تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بے عملی یا عملی کوتاہی میں مبتلا شخص کو داعیانہ کردار ادا نہیں کرنا چاہیے؛ بلکہ یہ آیت کریمہ عمل کی ترغیب دیتی ہے اور دعوؤں میں احتیاط سکھاتی ہے۔

چناں چہ حضرت اسامہ بن زیدؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: ”قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور اسے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا جس سے اس کے پیٹ کی آنتیں نکل آئیں گی، وہ آنتوں کو لے کر اس طرح گھومے گا جس طرح گدھا چکی کو لے کر گھومتا ہے، دوزخ والے اس کے پاس اکٹھے ہو کر کہیں گے: اے فلاں! تجھے کیا ہوا؟ (یعنی آج تو اس حالت میں کیوں ہے؟) کیا تو لوگوں کو نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور برائی سے نہیں روکتا تھا؟ وہ کہے گا: ہاں میں لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتا تھا لیکن خود اس نیکی پر عمل نہیں کرتا تھا اور لوگوں کو برائی سے منع کرتا تھا لیکن میں خود برائی میں مبتلا تھا“۔(صحیح مسلم، حدیث:۲۹۸۹)

نفاق: لغوی اور اصطلاحی حقیقت

نفاق دراصل ایک مہلک ترین روحانی بیماری اور دل کا وہ پوشیدہ روگ ہے جو انسان کے ایمان کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتا ہے۔

لغوی تحقیق:

لفظ ”نفاق“ کی اصل حقیقت کو دو لغوی مفاہیم کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے:

(ا) یہ ”نافقاء“ سے ماخوذ ہے۔ دراصل عربی زبان میں نافقاء کہتے ہیں جنگلی چوہے کے بِل کے خفیہ راستے کو۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جنگلی چوہا اپنے بل کے لئے دو الگ الگ راستے رکھتا ہے۔ ایک داخلے کے لئے اور ایک فرار کے لیے۔ اور فرار والے سوراخ پر مٹی کا ایسا باریک پردہ رکھتا ہے کہ باہر سے کسی کو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ جب کوئی اسے ایک راستے سے پکڑنے لگتا ہے، تو وہ اس خفیہ راستے سے بھاگ نکلتا ہے۔ منافق بھی بعینہٖ یہی رویہ اپنائے رکھتا ہے۔ وہ اسلام میں ایک راستے سے داخل ہوتا ہے اور موقع ملتے ہی دوسرے خفیہ راستے سے نکل جاتا ہے۔

(۲) بعض حضرات نے نفاق کو نَفَق سے مشتق مانا ہے۔یعنی اس سے مراد ایسی سرنگ یا سوراخ ہے جس میں انسان خود کو چھپالے۔(النهاية لإبن الأثير: ۵ / ۹۸)

نفاق کے شرعی معنی:

اور شرعی اصطلاح میں نفاق کا معنی ہے: اسلام کو ظاہر کرنا اور کفر کو دل میں چھپانا یا خیر کو ظاہر کرنا اور شر کو چھپانا۔ اور چوں کہ منافق اسلام کو ظاہر کرتا ہے اور کفر کو دل میں چھپاتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔(التوبۃ، آیت: ۶۷)

ترجمہ: ”بے شک منافق ہی فاسق لوگ ہیں۔“

نفاق کی دو بنیادی اقسام:

نفاق کا مفہوم بہت وسیع ہے۔عموماً لوگوں کے ذہن میں اس کا محدود تصور ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ نفاق نام ہے دل میں کفر کو چھپانے کا۔ جب کہ شریعت کی رو سے نفاق کی دو بنیادی اقسام ہیں:

(۱) نفاقِ اعتقادی:

یعنی انسان دل میں کفر چھپائے رکھے مگر زبان سے مصلحتاً یا خوف کی وجہ سے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے۔ یہ نفاق کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ اس کا انجام بدانتہائی ہولناک ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا

(سورۃ النساء، آیت: ۱۴۵)

ترجمہ: ”بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں رہیں گے، اور تم ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔“

(۲) نفاقِ عملی:

نفاق کی دوسری قسم عملی نفاق ہے، جس کا تعلق انسان کے اعمال، اس کی نیت اور اس کے اخلاق سے ہے۔

اگر انسان کے دل میں اخلاص نہ ہو اور وہ اعمالِ صالحہ محض نمود ونمائش کے لیے، یا سستی شہرت حاصل کرنے یا جھوٹی واہ واہ سمیٹنے کے لیے کرے، تو پھر یہ علامت ہے کہ ایسا انسان نفاقِ عملی کا شکار ہے۔ جب انسان بظاہر تو اللہ کی رضا کا دم بھرے، لیکن اس کے باطن کے نہاں خانوں میں یہ خواہش انگڑائی لے رہی ہو کہ مخلوق اس کے زہد، تقویٰ، سخاوت اور سجدوں کی معترف ہو، تو یہ بھی ایک طرح کا عملی نفاق ہے۔

علاماتِ نفاق اور معاشرتی نقصانات:

نفاق کی وجہ سے معاشرے میں بہت فساد پھیلتا ہے، اسی کا نقشہ کھینچتے ہوئے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ”تم قیامت کے دن اللہ پاک کے ہاں اس شخص کو سب سے بدتر پاؤ گے جو دو رخا ہو؛ جو کچھ لوگوں کے سامنے ایک چہرے کے ساتھ آتا ہے اور دوسروں کے سامنے دوسرے چہرے کے ساتھ جاتا ہے۔“ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”تَجِدُ مِنْ شَرِّ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ اللّٰهِ ذَا الْوَجْهَيْنِ، الَّذِي يَأْتِي هَؤُلَاءِ بِوَجْهٍ وَهَؤُلَاءِ بِوَجْهٍ“ (صحیح البخاری/ کتاب الادب/ حدیث: ۶۰۵۸)

ہم نفاق کو کیسے پہچانیں؟ اس کی علامات کیا ہیں؟ اس کا جواب بھی ہمیں حدیث پاک میں ملتا ہے۔

چناں چہ نبی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: ”چار عادتیں جس کسی میں ہوں تو وہ خالص (پکا) منافق ہے اور جس کسی میں ان چاروں میں سے ایک عادت ہو تو وہ (بھی) نفاق ہی کا ایک حصہ ہے، جب تک کہ اسے چھوڑ نہ دے: (۱) جب اسے امانت سونپی جائے تو خیانت کرے، (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، (۳) جب عہدو پیمان باندھے تو بے وفائی کرے، (٤) اور جب کسی سے لڑائی جھگڑا ہو تو آپے سے باہر ہو کر گالی گلوج پر اتر آئے۔“ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: ”أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ“ (صحیح البخاری/ کتاب الایمان/ حدیث: ۳۴)

حدیث پاک میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کذب بیانی سے فسادِ قول کی طرف اشارہ ہے، خیانت سے فسادِ عمل مراد ہے اور وعدہ خلافی سے فسادِ نیت بتایا گیا ہے۔

چناں چہ فسادِ نیت پر استدلال اس طرح ہے کہ وعدہ خلافی وہی معیوب عمل ہے جس میں وعدہ کرتے وقت یہ نیت کر لی گئی ہو کہ اسے پورا نہیں کرنا ہے اور اگر پورا کرنے کی نیت ہو اور کوشش کے باوجود اس کا ایفا نہ ہو سکے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں۔ چناں چہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں أَصْلُ الدِّيَانَةِ مُنْحَصِرٌ فِي ثلاثٍ: القولِ، والفعلِ، والنِّيَّةِ. فنَبَّهَ على فسادِ القولِ بالكذبِ، وعلى فسادِ الفعلِ بالخيانةِ، وعلى فسادِ النِّيَّةِ بالخُلْفِ، لأنَّ خُلْفَ الوَعْدِ لا يَقْدَحُ إلَّا إذا كان العَزْمُ عليه مُقارِناً للوعدِ، أمَّا لو كان عازماً ثمَّ عَرَضَ له مانعٌ أو بدا له رأيٌ، فهذا لم تُوجَدْ منه صورةُ النِّفاقِ (فتح الباری: ۱/ ۱۹۳)

علاوہ ازیں بعض عادتیں اور خصلتیں ایسی ہیں جن کو منافقوں سے خاص مناسبت حاصل ہے، جیسے:

(۱) خفیہ کینہ پروری: سامنے عقیدت و محبت کا والہانہ اظہار کرنا، اور پیٹھ پیچھے بغض، حسد اور عناد کی آگ میں جلنا۔

(۲) دوسروں کے نفاق کی تائید: اگر کوئی شخص خود تو براہِ راست نفاق یا سازش کا حصہ نہ بنے، لیکن دوسروں کے منافقانہ رویوں، غیبتوں اور سازشوں پر خاموش رہے یا دل ہی دل میں ان کا حامی ہو، تو وہ بھی اس نفاق کا برابر کا حصہ دار بن جاتا ہے۔

اسلاف کا طرزِ عمل اور فکرِ آخرت:

''حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہما، جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صحبتِ بافیض سے فیض یافتہ پاکیزہ جماعت ہیں، ان کے دل بھی نفاقِ عملی کے خوف سے لرزاں رہتے تھے۔''

سیّدنا حنظلہ رضی اللہ عنہ کا گلیوں میں ''نَافَقَ حَنْظَلَة'' (حنظلہ منافق ہوگیا) پکارتے ہوئے نکلنا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ مجلسِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دوری کے بعد اپنے دل کی کیفیت میں ہلکی سی تبدیلی کو بھی نفاق کا پیش خیمہ تصور کر رہے تھے۔ (صحیح مسلم، حدیث: ۶۹۶۶)

اسی طرح سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ (جن کے مؤمن کامل ہونے کی گواہی خود وحیِ الٰہی نے دی اور جنہیں زبانِ رسالت سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت ملی، ان) کا حال یہ تھا کہ وہ رازدارِ رسول حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھنے لگے: "اے حذیفہ! تمہیں اللہ کا واسطہ، مجھے بتاؤ کہ کہیں میرا نام بھی منافقین کی اس فہرست میں تو شامل نہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تمہیں بتائی تھی؟" حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے: "نہیں! (آپ کا نام اس میں نہیں) اور میں آج کے بعد کسی کے بارے میں یہ راز فاش نہیں کروں گا۔''

(مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث: ۳۰۱۷۳)

یہ تھی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ فکرِ آخرت اور نفاق کا ڈر، جس کی وجہ سے ان نفوسِ قدسیہ کے قلوب آئینے سے زیادہ شفاف تھے۔

لطافتِ قلب اور کثافتِ گناہ:

روحانیت کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ قلب ذکرِ الٰہی سے جتنا منور ہوتا ہے، وہ اتنا ہی لطیف اور حساس ہوجاتا ہے، اور لطیف چیز کثافت (گناہ کے اثر) کو لمحہ بھر کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ جیسے گلاب کا خالص عطر انتہا درجے لطیف ہوتا ہے۔ اگر وہ ایک بڑے ڈرم میں بھی موجود ہو اور اس میں نجاست کا ایک قطرہ گر جائے، تو وہ پورے عطر کو لمحوں میں نجس اور برباد کردیتا ہے۔ اس کے برعکس، جو چیز پہلے ہی کثیف اور گندی ہو (جیسے گندے پانی کی نالی) تو اسے مزید گندگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اسی طرح جب اللہ والوں کا دل کثرتِ ذکرِ الٰہی کی بدولت منور ہو جاتا ہے، تو انہیں اپنے اندر یا ماحول میں موجود گناہ یا نفاق کا ہلکا سا اثر بھی فوراً محسوس ہو جاتا ہے، جسے صوفیانہ اصطلاح میں "کشفِ قلب" کہتے ہیں۔ اس کے برعکس، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مہینوں کا مراقبہ اور ریاضت، دل میں آنے والے ایک گندے، منافقانہ اور متکبرانہ دھیان سے سیکنڈوں میں ملیامیٹ ہو سکتی ہے۔

تدارک اور حاصل کلام

آج کے اس پرفتن اور پرآشوب دور میں نفاق ایک وبائی مرض کی طرح ہمارے معاشرے کی رگوں میں اتر چکا ہے۔ آج کتنے لوگ ہیں جو اپنے اساتذہ، مشائخ اور اپنی مساجد کے اماموں کے سامنے عقیدت و احترام کے بڑے بڑے راگ الاپتے ہیں، مگر پیٹھ پیچھے بدظنی، غیبت اور کینہ پروری کی جسارتوں سے بھی گریز نہیں کرتے۔

اس مہلک روحانی بیماری کا واحد علاج یہ ہے کہ انسان اپنے دل کے نہاں خانے سے ہر قسم کے دھوکے، نمود و نمائش، ریاکاری اور دوغلے پن کو نکال باہر پھینکے اور دل کو نفاق کے اندھیروں سے پاک کرنے کے لیے اس میں "ذکرِ الٰہی کا چراغ" روشن کرے۔ جب انسان خلوصِ نیت کے ساتھ کثرت سے اللہ پاک کا ذکر کرتا ہے، تو دل منور ہو جاتا ہے اور باطن کے تمام سانپ، بچھو اور کثافتیں خود بہ خود دم توڑ دیتی ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ہمہ وقت اپنے خاتمہ بالخیر کی فکر کریں، اپنے ظاہر و باطن کو ایک رنگ میں رنگیں، اور دوسروں کے عیب ٹٹولنے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفاقِ اعتقادی و عملی سے محفوظ فرمائے اور اخلاصِ کامل کی دولتِ سرمدی سے مالا مال کرے۔ آمین یارب العالمین!

☆☆☆

نورِ نبوّت

(درسِ حدیث شریف)

صبر: حقیقت، فضائل اور انعامات

ضبط وترتیب: مفتی سید عبد الرافع قاسمی

عَنْ أَبِي يَحْيىٰ صُهَيبِ بنِ سنَانٍ رضِيَ اللهُ عَنهُ قَالَ: قالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ عَجَبًا لأَمرِ المؤمنِ إنَّ أمرَه كلَّه خيرٌ إنْ أصابَتْه سرّاءُ شَكَرَ وإنْ أصابَتْه ضرّاءُ صَبَرَ وَ كَانَ خيرًا له وليس ذلك لأحدٍ إلّا للمؤمنِ (رَواهُ مُسلمٌ، الرقمُ: ۲۹۹۹)

ترجمہ: حضرت ابو یحییٰ صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مؤمن کا معاملہ عجیب ہے۔ اس کا ہر معاملہ بھلائی (ہی بھلائی) ہے، اگر اس کو خوشی اور خوشحالی ملے تو (نعمت الٰہی پر) شکر کرتا ہے اور اگر اسے کوئی نقصان پہنچے تو (اللہ کی رضا کے لیے) صبر کرتا ہے۔ اور یہ (بھی) اس کے حق میں بھلائی ہی ہے، اور یہ بات مؤمن کے سوا کسی اور کو میسر نہیں۔

تشریح:

یہ دُنیا امتحان گاہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مختلف حالات سے آزماتے رہتے ہیں۔ چناں چہ کبھی خوشیوں اور راحتوں کے مواقع پیش آتے ہیں تو کبھی غموں اور تکلیفوں کی صورت حال، اسی طرح کبھی صحت رہتی ہے تو کبھی بیماری، کبھی نفع اور کامیابی مقدر بنتی ہے تو کبھی نقصان اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

غرض یہ کہ تمام احوال دو طرح کے ہیں: موافقِ طبیعت اور مخالفِ طبیعت۔ اور شرعی اعتبار سے ان کے تقاضے بھی مختلف ہیں، موافقِ طبیعت حالات میں بندگی کا حق ہے کہ اللہ جلَّ شانہٗ کا شکر ادا کریں اور مخالفِ

استاذ ابوہریرہ اکیڈمی اورنگ آباد (آن لائن)

طبیعت حالات میں فیصلۂ الٰہی پر رضامند رہتے ہوئے صبر سے کام لیں۔

اور یہ بھی کتنی عمدہ بات ہے کہ مؤمن کو پیش آنے والے یہ احوال کبھی اس کے گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنتے ہیں تو کبھی اس کے حق میں نیکیوں کا باعث اور کبھی بلندیٔ درجات کا وسیلہ۔ ان کی نوازش و بخشش اور شانِ کریمی تو دیکھیں کہ ہر حال بندے کو نوازنے اور عطا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ع

کتنے بڑے ہیں حوصلے پروردگار کے

صبر و شکر (دونوں ہی احوال) کے اپنے اپنے تقاضے ہیں اور دونوں کے الگ الگ انعامات؛ لیکن ان میں سے احوالِ صبر میں صبر کرنے کی ترغیب و فضیلت نسبتاً زیادہ منقول ہے۔ اس لیے صبر کے حوالے سے کچھ باتیں پیش ہیں۔

صبر کی تعریف:

صبر کے لغوی معنیٰ ہیں: ہمت سے کام لینا، برداشت کرنا اور کسی چیز سے رکنا وغیرہ (القاموس الوحید، صفحہ: ۹۰۸)

اور اصطلاح میں "صبر نام ہے نفس کو اس کی ناجائز خواہشات سے روکنے کا"۔ اس اعتبار سے صبر کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اب اس میں تمام گناہوں اور خلافِ شرع کاموں سے پرہیز بھی شامل ہوگیا۔

(معارف القرآن: ۴/ ۵۹۸)

صبر کی قسمیں:

مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ صبر تین طرح کا ہے:

(۱) الصبر عن المعصية: گناہوں سے رکے رہنا۔

(۲) الصبر علی الطاعة: طاعات وعبادات پر جمے رہنا۔

(۳) الصبر علی المصيبة: ناگوار حالات کو بخوشی برداشت کرنا۔ (معارف القرآن: ۱/ ۳۳۸)

چناں چہ ہمارے حضرت جی قدس سرہ نے فرمایا کہ: "صبر کی مذکورہ تین قسمیں درجات کے اعتبار سے بھی اسی ترتیب پر ہیں یعنی طاعات وعبادات پر جمے رہنا، ناگوار حالات کو بخوشی برداشت کرنے سے افضل درجہ ہے اور گناہوں سے رکے رہنا، طاعات وعبادات پر جمے رہنے سے افضل ہے۔"

صبر کے درجات:

صبر کے تین درجات ہیں: ابتدائی درجہ ہے خاموش رہنا، چپ رہنا اور بخوشی برداشت کرنا، یہ مقامِ صالحین ہے۔ درمیانی درجہ یہ ہے کہ شکوہ وشکایت کے الفاظ زبان پر نہ لائیں، یہ مقامِ عارفین ہے۔ اور انتہائی

درجہ یہ ہے کہ اللہ پاک سے ہر حال میں راضی رہیں، جو حال آئے اسے خوشی خوشی برداشت کریں، یہ مقامِ صدیقین ہے۔

قول حضرت جی قدس سرہ کے"صبر کا انتہائی درجہ اگرچہ مطلوب نہیں مگر محمود و پسندیدہ ہے اور یہ بڑوں کا مقام ہے، ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔"

صبر کی فضیلت:

صبر کے فضائل بہ کثرت نصوص میں وارد ہوئے ہیں: چند ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ارشادِ ربانی ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (سورۂ بقرہ، آیت: ۱۵۵)

ترجمہ: اور (دیکھو) ہم (صفتِ رضا و تسلیم میں جو کہ مقتضا ایمان کا ہے) تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ ہجومِ مخالفین یا نزولِ حوادث و شدائد سے پیش آوے) اور (کسی قدر فقرو) فاقہ سے اور (کسی قدر) مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے (مثلاً مویشی مر گئے یا کوئی آدمی مر گیا یا بیمار ہو گیا یا پھل اور کھیتی کی پیداوار تلف ہو گئی پس تم صبر کرنا) (اور جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اتر آویں اور مستقل رہیں) تو آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجیے۔ (بیان القرآن)

مذکورہ آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صبر کرنے والوں کو محبوب علیہ السلام کی زبانی خوش خبری سنائی ہے۔

ایک علمی نکتہ:

اس آیت مبارکہ کی تشریح میں ہمارے حضرت جی قدس سرہ ایک علمی نکتہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ "اس آیتِ مبارکہ میں وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ سے پہلے ایک جملہ محذوف ہے۔ یہ کہنا چاہیے تھا کہ ''جب تمہیں اس طرح ہم آزمائیں تو تم صبر کرو''، پھر آگے کہا جاتا کہ ''خوش خبری دیجیے صبر کرنے والوں کو''، بجائے اس کے براہِ راست صابرین کو خوشخبری سنائی گئی، تو گویا اس میں پیغام دیا گیا ہے کہ میرے بندو! اگر یہ صورت حال تمہارے ساتھ پیش آئے تو سوائے صبر کے کوئی راستہ نہیں، چوں کہ صبر کرنا متعین ہی ہے؛ اس لیے اس کو حذف کر دیا گیا۔" اس کو علمِ بلاغت کی اصطلاح میں "التَّنْبِيهُ عَلَى تَعْيِينِ الْمَحْذُوفِ" کہتے ہیں۔

اسی طرح ایک دوسری آیتِ مبارکہ میں قرآن عظیم الشان صابرین کے اجر سے متعلق بیان فرماتا ہے:

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (سورۃ الزمر، آیت: ۱۰)

ترجمہ: مستقل مزاجی والوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا۔ (بیان القرآن)

اس آیتِ مبارکہ میں قرآن عظیم الشان نے دو الفاظ استعمال فرمائے ہیں:

(۱) **یُوَفّٰی**: پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، (۲) **بِغَیْرِ حِسَابٍ**: بغیر حساب عطا کیا جائے گا۔

درحقیقت یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی تشریح ہیں جن کا ملا جلا مطلب یہ ہوگا کہ صابرین کو اجر پورا پورا دیا جائے گا کچھ کمی نہیں ہوگی اور ناپ تول کے بغیر عطا کیا جائے گا، ایسا نہیں ہوگا کہ بدلہ پورا پورا تو دیا گیا مگر ناپ تول کر دیا گیا، کیوں کہ یہ شانِ عطائی کے مناسبِ حال نہیں اور یہ بھی نہیں کہ بغیر حساب تو عطا ہوا مگر پورا پورا عطا نہیں ہوا۔ چناں چہ قرآنِ عظیم الشان نے ایک لفظ سے پیدا ہونے والے احتمال کو دوسرے لفظ سے اور دوسرے لفظ سے پیدا ہونے والے احتمال کو پہلے لفظ سے دفع کر دیا۔ سبحان اللہ! کیا حسنِ بیان ہے اور شانِ کریمی کا کیسا اظہار ہے!

اسی طرح صبر کی فضیلت میں محبوب علیہ السلام کا ارشاد ہے: **وَلَنْ تُعْطَوْا عَطَاءً خَيْرًا وَ أَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ** (صحیح البخاری/ کتاب الرقاق/ حدیث: ۶۴۷۰)

ترجمہ: "اللہ پاک کی کوئی نعمت صبر سے بڑھ کر تم کو نہیں ملی۔" چناں چہ کوئی چیز بہترین ہونے کے اعتبار سے اور اپنی ظاہری و باطنی وسعت کے اعتبار سے صبر سے بڑھ کر نہیں۔

ایک اور حدیثِ مبارک میں صبر کو گناہوں کا کفارہ بتایا گیا ہے، چناں چہ ارشادِ مبارک ہے: **ما يُصِيبُ المُسْلِمَ، مِن نَصَبٍ ولا وَصَبٍ، ولا هَمٍّ ولا حُزْنٍ ولا أذًى ولا غَمٍّ، حتّى الشَّوْكَةِ يُشاكُها، إلّا كَفَّرَ اللَّهُ بها مِن خَطاياهُ** (صحیح مسلم/ کتاب البر والصلۃ والآداب/ حدیث: ۶۵۶۸)

ترجمہ: محبوب علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ: مؤمن کو کوئی تھکن نہیں پہنچتی، نہ بیماری، نہ غم، نہ تکلیف حتیٰ کہ کوئی کانٹا بھی جو اسے چبھے مگر اس کے بدلے اس کے گناہوں کو مٹا دیا جاتا ہے۔"

ایک اہم بات:

لیکن اسی کے ساتھ ایک بنیادی بات بھی ہمیں معلوم ہونی چاہیے کہ کبھی صبر مانگنا نہیں چاہیے؛ ہاں اگر صبر کی کوئی حالت پیش آجائے تو پھر خوش دلی کے ساتھ صبر کرتے ہوئے اس کا استقبال کرنا چاہیے۔ چناں چہ ایک صحابیؓ کو محبوب علیہ السلام نے صبر کی دعا کرتے ہوئے سنا تو ارشاد فرمایا: "**فَسَلْهُ العافِيَةَ**" اللہ پاک سے عافیت کا سوال کرو۔ (سنن ترمذی، حدیث: ۳۵۲۸)

نکتہ:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ پاک کے مقرب بندوں جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچے وارثین و

نائبین پر بھی صبر کے حالات آتے ہیں، تو ایسے احوال ان کے لیے رفعِ درجات کا سبب بن جاتے ہیں۔ پھر ایک ایک تکلیف بندے کو اللہ پاک کے اتنے قریب کرتی ہے کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی فاصلہ ہی نہیں رہتا، پس اس کے مرنے کی دیر ہوتی ہے اور اللہ پاک اس کو اپنی رحمت میں ایسے لے لیتے ہیں کہ دنیا حیران ہوجاتی ہے۔

صبر کے سلسلے میں وارد فضائل کے علاوہ، اس کی اہمیت کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ صبر محبوب علیہ السلام کی زندگی کی مستقل سنت ہے۔ اس لیے کہ آپ علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ کا تقریباً تمام ہی حصہ انتظامی اور اسبابی اعتبار سے صبر کے ساتھ گزرا ہے۔

صبر پر ملنے والے انعامات:

حضرت جی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ صابر کو چند بڑے بڑے انعامات اس دنیا میں ہی نصیب ہو جاتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی معیت (یعنی اللہ تعالیٰ کا ساتھ)۔ چناں چہ قرآنِ عظیم الشان میں ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۵۳)

ترجمہ: بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ (بیان القرآن)

(۲) اللہ تعالیٰ کی حفاظت: صابر ہر وقت اللہ پاک کی حفاظت و نگرانی میں ہوتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا (سورۃ آل عمران، آیت: ۱۲۰)

ترجمہ: اور اگر تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی۔ (بیان القرآن)

(۳) امامت کا درجہ: صابر سے امامت کا کام لیا جاتا ہے کہ دنیا اس کے پیچھے پیچھے ہوتی ہے جیسا کہ قرآن عظیم الشان کا بیان ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ

(سورۃ السجدہ، آیت: ۲۴)

ترجمہ: اور ہم نے ان میں جب کہ انہوں نے صبر کیا بہت سے پیشوا بنا دیے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے۔ (بیان القرآن)

(۴) صبر انسان کو مقامِ صدیقیت تک پہونچا دیتا ہے۔ اور صدیقیت، نبوت کے بعد سب سے بڑا درجہ ہے۔

دو شبہات اور ان کا ازالہ:

(۱) جب اللہ تعالیٰ بغیر مانگے عطا کرنے اور نوازنے پر قادر ہیں تو نوازنے کے لیے بندے پر ناموافق حالات بھیج کر اس کو آزمایا کیوں جاتا ہے؟

(۲) نیز جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بے انتہاء محبت فرماتے ہیں تو اپنے بندے کا مصیبت و پریشانی میں مبتلا ہونا کیسے گوارا کر لیتے ہیں؟

جواب: (۱) حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "جو شخص اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے، پریشانیاں اس کی طرف لپک کر آتی ہیں"۔ دریافت کیا گیا کہ ایسا کیوں؟ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ: "تا کہ ہر کمینہ شخص اس کی محبت کا دعویٰ کرنے کی ہمت نہ کرے"، دراصل اس میں راز یہی ہے جو حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے ورنہ اللہ پاک کو ستانے سے کیا ملے گا۔

(۲) دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عجیب معاملہ ہے، اس کو یوں سمجھیے جیسے ماں کو جب اپنے بچے پر بڑا لاڈ آجاتا ہے اور اس پر پیار کی کیفیت چھا جاتی ہے تو وہ کبھی کبھی بچے کی ایک چٹکی لیتی ہے جس پر بچہ رونے لگتا ہے، اس کا چہرہ بن جاتا ہے، آنسو نکلتے ہیں اب پھر اسے سینے سے لگا لیتی ہے اور خوب لاڈ پیار کرتی ہے، معلوم ہوا کہ اس ماں کو اپنے بچے کو گلے لگانے کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ اور سبب چاہیے تھا۔ ایسے میں خود اسی نے غایتِ محبت میں تکلیف دی اور جب بچہ تکلیف سے رونے لگا تو خود ہی گلے لگا یا، ٹھیک یہی معاملہ اللہ پاک کا اپنے بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اللہ پاک اپنے انہی بندوں کو مصیبت میں مبتلا فرماتے ہیں جن سے محبت ہوتی ہے۔

جیسا کہ ایک حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ: "ایک صحابی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، میں آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "دیکھ لو تم کیا کہہ رہے ہو؟" انہوں نے عرض کیا، اللہ کی قسم! میں آپ سے محبت کرتا ہوں، انہوں نے تین مرتبہ کہا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو تو پھر فقر و فاقہ سے مقابلہ کرنے کے لیے ڈھال تیار رکھو؛ کیوں کہ جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے تو اس کی طرف فقر سیلاب کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے آتا ہے۔"

(مشکوۃ المصابیح/ کتاب الرقاق/ حدیث: ۵۲۵۲)

ہر حال میں صبر کا دامن تھامے رکھیں:

مصائب اور آلام، تکلیفیں اور پریشانیاں چاہے جیسی ہوں، ایک بندۂ مؤمن کو ہمیشہ صابر رہنا چاہیے۔ یہی

اسوۂ انبیاء ہے۔ چناں چہ حدیث مبارک میں ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جیسے میں (اس وقت) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں آپ ایک پیغمبر (علیہ السلام) کی حکایت بیان کررہے تھے کہ ان کی قوم نے ان کو اتنا مارا کہ جسم سے خون بہنے لگا۔ وہ پیغمبر اپنے منہ سے خون پونچھتے جاتے اور ساتھ ہی دعا کرتے جاتے: رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي، فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْن (پروردگار میری قوم کو بخش دے وہ نادان ہیں)۔

(صحیح البخاری/کتاب استتابۃ المرتدین/حدیث: ۶۹۲۹)

اس میں سبق ہے خاص طور پر نائبینِ انبیاء کے لیے اور پوری امت کے لیے بھی کہ اس قدر ظلم کے باوجود انبیاء علیہم السلام اپنی قوم کے حق میں شفقت و رحمت کا مظہر ہوا کرتے تھے۔

مصیبتوں میں موت کی تمنّا کرنا:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹنے لگتے ہیں، اور پیہم تکالیف کی وجہ سے زمین اپنی کشادگی کے باوجود تنگ محسوس ہوتی ہے، ایسے موقعے پر لگتا ہے کہ موت کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ لیکن ایسے سخت حالات میں بھی موت کی تمنا کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں البتہ موت کی دعا کرنی ہی ہو تو اس طرح کر سکتے ہیں جیسا محبوب علیہ السلام نے سکھایا ہے۔ ارشاد فرمایا: ”کہ کسی تکلیف میں اگر کوئی شخص مبتلا ہو تو اسے موت کی تمنا نہیں کرنی چاہیے اور اگر کوئی موت کی تمنا کرنے ہی لگے تو یہ کہنا چاہیے: اللّٰھُمَّ أَحْيِنِي مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِي، وَتَوَفَّنِي إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِي (اے اللہ! جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہے مجھے زندہ رکھ اور جب موت میرے لیے بہتر ہو تو مجھ کو اٹھا لے)“

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرٍّ أَصَابَهُ، فَإِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَلْيَقُلْ، اللّٰهُمَّ أَحْيِنِي مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِي، وَتَوَفَّنِي إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِي (صحیح البخاری/کتاب المرضی/حدیث: ۵۶۷۱)

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر موقعے پر راضی برضائے الٰہی رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے مقبول بندوں میں ہمیں بھی شامل فرمالیں۔ (آمین)

☆☆☆

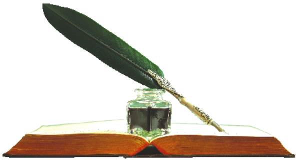

سُخنِ اوّلیں

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ہماری عملی زندگی

(ماہِ ربیع الاول کی مناسبت سے کچھ معروضات)

از: مدیر

ماہِ ربیع الاوّل کی آمد آمد ہے۔ اس ماہِ منور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اسی مہینے میں ہمارے آقا محبوبِ ربِ دو جہاں، سرورِ کونین، خاتم النبیین والمرسلین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اِس جہانِ آب و گِل میں ولادتِ باسعادت ہوئی۔ چناں چہ جوں ہی یہ مہینہ آتا ہے، مسلمانوں میں بھی ایک طرح کا نیا جوش وخروش پیدا ہوجاتا ہے۔ کہیں جلسے جلوس کے اشتہارات ہیں، تو کہیں جشنِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا شور وغوغا، کہیں نعتیہ محفلوں کا انعقاد ہے تو کہیں گھروں، گلیوں، محلوں اور چوراہوں پر سبز جھنڈیاں۔ غرض لوگوں کے یہاں محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اظہار کے مختلف طریقے ہیں؛ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کی سیرت سے اس کا کیا تعلق ہے؟

”سیرت کا مطلب تو ہے طرزِ زندگی، یعنی کردار وعمل کے وہ خطوط، جن کا تعلق پوری زندگی سے ہوتا ہے“۔

چناں چہ آقا علیہ السلام کی مبارک سیرت کا مطلب ہے: ”آپ کی پاکیزہ عادتیں اور پُرکشش خصلتیں، آپ کا مبارک کردار اور خوبصورت سنتیں، آپ کا مقدس طرزِ زندگی اور اس کی کُل سانسیں اور ساعتیں“۔ جی ہاں! سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں محض چند واقعات اور کچھ مخصوص گوشے نہیں ہیں؛ بلکہ اس میں عقائد کی تعلیم بھی ہے اور عبادات کے طور طریق بھی، معاملاتِ زندگی کی ہدایات بھی ہیں اور معاشرتی زندگی کے آداب بھی، اخلاقیات کا وسیع ترین باب بھی ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی فراہم کرنے والے رہنمایانہ خطوط بھی۔ غرض آپ علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کا ہر پہلو ”راہنما“ ہے اور آپ کی زندگی کا ہر مرحلہ (کسی نہ کسی اعتبار سے) انسانیت کے حق میں ”قابلِ عمل“ اور ”لائقِ تقلید“ ہے۔ جب آپ کی سیرتِ مبارکہ اس قدر ”جامع ومکمل“ اور اس حد تک ”راہنما اور قابلِ تقلید“ ہے تو اس کا تذکرہ سال بھر ہونا چاہیے۔ اس کے بجائے تذکرۂ سیرت کو کسی ایک مہینے کے ساتھ خاص

کر دینا، ایک طرح کی رسمیت ہے؛ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ بھی ایک قسم کی عملی کوتاہی ہے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ تذکرۂ سیرت میں ولادت وطفولیت، ہجرت ورحلت یا فتح ونصرت جیسے چند منتخب واقعات یا چنیدہ موضوعات ہی نہیں؛ بلکہ اس مقدس زندگانی کے ہر ہر گوشے کو بیان کرنا چاہیے۔ آج پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ ہم آپ ﷺ کی پاکیزہ سیرت بالتفصیل پڑھیں، آپ کی زندگی کے ہر ہر گوشے کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کریں اور اپنی اگلی نسلوں کو اس سے باخبر کروائیں۔

☆☆☆

ماہِ ربیع الاول میں بدعات وخرافات؛ بلکہ آگے بڑھ کر واہیات بھی بہت ہونے لگتی ہیں۔ کہیں جشنِ میلاد النبی کا عنوان ہے تو کہیں محبتِ رسول ﷺ کا دعویٰ؛ لیکن کہنا چاہیے کہ بہت سی جگہوں پر آپ علیہ السلام کی سیرت کی اتباع اور احکامِ شریعت کی پاسداری کا دور دور تک لحاظ نہیں ہوتا۔ کہیں جھنڈیوں پر لکھے ہوئے "کلمۂ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کی بے حرمتی ہوتی ہے تو کسی جگہ "یا رسولَ اللہ" کے نعروں کا شور، کہیں آپ کے ماہِ ولادت کی خوشی میں مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں تو بعضے علاقوں میں گلیوں، سڑکوں اور بازاروں میں راستے بند کر کے جلسے منعقد کیے جاتے ہیں۔ ایسے میں کبھی راہ گیر تکلیفوں میں مبتلا ہوتے ہیں تو کہیں پڑوسی اذیتوں کے شکار۔ غور کیا جائے کہ کیا یہ طرزِ عمل درست ہے؟ کیا اِن امور کا کسی درجہ میں بھی سنتِ رسول ﷺ سے ثبوت ملتا ہے؟ اور کیا شریعت میں اس کی اجازت ہے؟ ہمارے آقا علیہ السلام کے اخلاق اتنے اعلیٰ اور آپ کا کردار اس قدر صاف و شفاف ہے کہ انسان تو انسان، کسی جانور کو بھی آپ سے کوئی تکلیف نہیں پہونچی۔ پھر محبتِ رسول ﷺ کے نام پر دوسروں کو تکلیف دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ کہیں یہ محبت کے نام پر نفس پرستی تو نہیں؟ یقین جانیے کہ اس کا سچے عشقِ رسول ﷺ سے دور دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ حقیقی عشقِ رسول ﷺ تو ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں نظر آتا ہے، جنھوں نے آپ کی سیرتِ مبارکہ کی ایک ایک ادا کو اپنے اندر جذب کیا تھا، پھر ان کا قال اور حال، ان کا کردار اور افعال واعمال: سب کے سب اتباعِ سیرت کے عملی نمونے بن گئے تھے۔

☆☆☆

نبی علیہ السلام کی سیرتِ مبارکہ کو اللہ تعالیٰ نے اسوۂ حسنہ (Role model) قرار دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ الاحزاب: ۲۱)

ترجمہ: "یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔" جب آپ کی سیرتِ مطہرہ کی ہمارے حق میں اس قدر اہمیت ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہم آپ کی سیرت کو اسی نگاہ سے

دیکھتے ہیں؟ عملی صورت حال تو یہ ہے کہ ہم میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو آپ علیہ السلام کو زندگی کے بہت سے گوشوں میں اپنا رول ماڈل تسلیم نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کی سنتوں پر عمل کرنے کی بات آتی ہے (تو زبانِ قال سے نہ سہی) زبانِ حال سے ہی بہانے تلاش کیے جاتے ہیں۔ کبھی افرادِ خانہ کی ناراضی کی بات تو کبھی خاندان اور معاشرے کی طرف سے رکاوٹوں کا عذر۔ چناں چہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک طرف ربیع الاول کے مہینے میں جشنِ آمدِ رسول منایا جارہا ہے اور دوسری طرف لوگ اپنے ہی ہاتھوں سے نبی علیہ السلام کی سنت (ڈاڑھی) کو ذبح کررہے ہیں۔ ایک طرف محبتِ رسول میں پُرجوش نعرے بازیاں بھی ہیں اور دوسری طرف اپنے اعمال سے سنتِ رسول کا جنازہ نکال رہے ہیں۔ غور کیجیے کہ کیا یہ محبتِ رسول ہے؟ یا محبتِ رسول کے نام پر بھونڈا مذاق۔ کسی عربی شاعر کا یہ شعر کس قدر سچا ہے

لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَأَطَعْتَهُ

فَإِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيعُ

(ترجمہ: اگر تو اپنی محبت میں سچا ہوتا تو محبوب کے نقشِ قدم پر ضرور چلتا؛ اس لیے کہ عاشق تو اپنے محبوب کا (جان و دل سے) اطاعت گذار ہوتا ہے۔)

چناں چہ محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنی ہر خواہش پر، اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ترجیح دیں۔ ہم اپنی اولاد سے، اپنے والدین سے اور آگے بڑھ کر خود اپنے آپ سے بھی زیادہ نبی علیہ السلام سے محبت کریں۔ یہی سچی محبت کا معیار ہے اور یہی کمالِ ایمان کی نشانی۔ خود آپ علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے: لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (صحیح بخاری، حدیث: ۱۵)

ترجمہ: "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے والد، اس کی اولاد، اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔"

محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معیار آپ علیہ السلام کے ہر امتی کے لیے ہے۔ چناں چہ بخاری شریف میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے نبی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ "یارسول اللہ! آپ مجھے میری جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ اس پر آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ نہیں، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! جب تک میں تمہیں تمہاری اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں (اس وقت تک محبت سچی اور ایمان کامل نہیں ہوسکتا)۔" اس پر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ "اب۔ اللہ کی قسم! آپ مجھے میری اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔" جب انہوں نے یہ بات کہی تو آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: "اب (ایمان مکمل

ہوا)، اے عمر!“ (صحیح بخاری، حدیث: ۶۶۳۲)

چناں چہ نبی علیہ السلام کی اتباع اور کامل اتباع، امت کے ہر ہر فرد سے مطلوب ہے۔ یہی حکمِ ربانی ہے۔ اسی لیے ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ ”اتباعِ سنت“ پورے سلوک کی جان ہے۔ اگر کوئی سالک ہو، اور اس کی زندگی میں سنتوں کی اتباع نہ ہو تو پھر اس نے گویا ابھی تک سلوک میں قدم بھی نہیں رکھا۔ اور مشائخ کا یہ فرمان دراصل آیت کریمہ: فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ (تم میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا) کے تحت ہے۔ اس آیت کریمہ سے بدیہی طور پر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ”اللہ پاک کی محبت کو پانے کے لیے (خلافِ سنت طریقوں پر) بھوکے پیاسے رہنے، اپنی طرف سے طرح طرح کی ریاضتیں کرنے یا جنگلوں میں گھومنے اور غاروں میں پناہ گزیں ہونے کی نہیں؛ بلکہ زندگی کے تمام امور میں سنتوں کی کامل اتباع کی ضرورت ہے۔“ یہی وجہ ہے کہ ”اتباعِ سنت“ ہمارے مشائخ کی زندگی کا خصوصی اور امتیازی پہلو ہے۔

ہمارے حضرت جی (محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی) قدس سرہ کو بھی اتباعِ سنت میں کمال حاصل تھا۔ ایک دو نہیں، اس حوالے سے سینکڑوں واقعات مل جائیں گے۔ ایک موقع پر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ شروع شروع میں میری داڑھی ہلکی تھی، زیادہ گھنی نہیں تھی۔ پھر جب میں نے یہ پڑھا کہ محبوب علیہ السلام کی داڑھی مبارک بہت گھنی تھی تو میں نے رو رو کر اللہ سے دعا مانگی کہ اللہ! میری داڑھی کو بھی گھنی کر دیجیے۔ چناں چہ میری دعا قبول ہوگئی۔

☆☆☆

محبت بھی بڑی عجیب شئی واقع ہوئی ہے کہ اس میں قرار اور ٹھہراؤ نہیں ہے۔ یہ رفتہ رفتہ بڑھتی بھی ہے اور پھیلتی بھی۔ پہلے محبوب کی ہستی محور بنتی ہے، پھر کچھ اور تعلق بڑھتا ہے تو محبوب کی اداؤں کے اتباع کے بغیر چین نہیں آتا۔ پھر تعلق میں مزید اضافہ ہوتا ہے تو متعلقاتِ محبوب سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ نبی علیہ السلام سے سچی محبت کرنے والوں کا بھی یہی معاملہ ہوتا ہے۔ حیدر آباد (دکن) کے ایک نقشبندی بزرگ گذرے ہیں، محدثِ دکن حضرت مولانا عبد اللہ شاہ صاحب نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، وہ جب حج کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تو غارِ حرا پر بھی گئے۔ غار حرا کا محلِ وقوع کچھ اس طرح ہے کہ اندر سے تو تھوڑا سا کشادہ ہے؛ لیکن اس میں داخل ہونے کا راستہ کافی تنگ ہے۔ اتنا کہ جب بھی کوئی اس میں داخل ہونے لگے تو خواہی نہ خواہی اس کے جسم کا حصہ غار کے دہانے سے مس ہوگا۔ چناں چہ حضرت عبد اللہ شاہ صاحبؒ جب اس میں داخل ہونے لگے تو اپنا کرتا اتار دیا اور جسم کے حصوں کو غار کے مختلف حصوں سے عمداً مَس کرنے لگے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ حضرت!

(آپ کے اس طرزِ عمل کی) کوئی وجہ؟ کہنے لگے کہ غار کے اس دہانے سے نبی علیہ السلام یقیناً بے شمار دفعہ داخل ہوئے ہیں۔لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ میرے جسم کے حصے کم از کم غار کے ان حصوں سے ہی مَس ہو جائیں، جن سے نبی علیہ السلام کے جسمِ اطہر کے حصے کبھی مَس ہوئے تھے۔سبحان اللہ! سچے عُشاقِ رسول ﷺ ایسے ہوتے ہیں اور ایسے ہی عشاق کے بارے میں یہ نبوی بشارت ہے: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ (صحیح بخاری، حدیث:۶۱۶۹)

ترجمہ: "آدمی اُسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہوگا۔"

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی علیہ السلام کے سچے عشاق کی جماعت میں شامل فرمائے۔

(آمین یارب العالمین بجاہ سید المرسلین)

غریبم یا رَسول اللہ غریبم
ندارم در جہاں جز تو حبیبم
بریں نازم کہ ہستم اُمّتِ تو
گنہگارم و لیکن خُوش نصیبم

یا رسول اللہ! میں غریب و بے نوا ہوں
نہیں کائنات میں آپ کے سوا میرا کوئی محبوب
مجھے ناز ہے کہ میں آپ کا اُمتی ہوں
گنہ گار ہوں پر خوش نصیب ہوں

اکابِرشناسی

سلسلہ نمبر (۵)

خداوندا! مقصودِ من توئی ورضائے تو

ابوسیّد محمد اللہ غوری

انسان کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں اہل عقل وفکر، اہل دانش وبینش اور فلاسفہ ومناطقہ نے متعدد جہات سے اپنی اپنی تحقیقات پیش کیں۔ کسی کے ہاں یہ حیوان ناطق ہے تو کسی کے نزدیک عناصر اربعہ (آگ، پانی، مٹی اور ہوا) سے مرکب، کسی کا خیال ہے کہ اس کا خمیر انس سے اٹھا ہے تو کسی کی نظر اس کی عادتِ نسیان پر ہے۔ بعضے لوگ کہتے ہیں کہ عقل وشعور اور ادراک وارادہ ہی انسان کی اصل طاقت ہے اور اُس کا وصفِ امتیازی تو کسی نے اُس کو عالمِ اکبر (دنیا) کے مقابلے میں عالم اصغر سے تشبیہ دی۔

غرض جہاتِ تفکر کے تنوّع اور اندازِ غور وفکر کے اختلاف کے مطابق ہر طبقے کی اپنی اپنی رائے ہے اور فی الواقع درست بھی ہے۔ لیکن اگر ہم انسان کے خالق اور پروردگارِ عالم کے کلام پاک میں اس سوال کا جواب تلاش کریں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ انسان کی حقیقت ایک "عبدِ محض" یعنی "غلامِ بے دام" کی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت، سورۃ الفاتحہ میں یہی بات سکھائی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے: إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ (ترجمہ: ہم آپ ہی کی بندگی کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں) اسی طرح سورۃ الذرایات میں ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

(ترجمہ: اور میں نے انسانوں اور جنات کو محض اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا)

ان دونوں آیات کریمہ میں انسانوں کا مقصدِ تخلیق بھی بتایا گیا ہے اور مقصود زندگی بھی اور وہ ہے اپنے مالک وخالق حقیقی کی بندگی اور ان کی غلامی!

عبدیت کی حقیقت:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل علم کے مجمع سے خطاب کے دوران دریافت کیا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (ترجمہ: اور میں نے انسانوں اور جنات کو محض اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا)۔ یعنی جنات وانسانوں کی پیدائش کا مقصد صرف اور صرف عبادتِ پروردگار ہے۔ حالانکہ دوسری مخلوقات فرشتے وغیرہ بھی اللہ کی عبادت (تسبیح وتحمید) میں مصروف رہتے ہیں۔ آخر اس تخصیص کی وجہ کیا ہے؟ جب کسی سے کوئی شافی جواب نہ بن پڑا تو خود ہی ارشاد فرمایا کہ عبادت کے معنی "عبد شدن" کے ہیں اور عبد غلام کو کہتے ہیں اور غلام کی یہ شان ہوتی ہے کہ اس کی خدمت معین نہیں ہوتی۔ ایک وقت میں اس سے قلمدان اور بستہ اٹھواتے ہیں، (اور) ایک وقت میں پائخانہ اٹھواتے ہیں۔ بخلاف اجیر ونوکر کے کہ اکثر اس کی خدمت معین ہوتی ہے۔ پس اور مخلوقات کی عبادت تو معیّن ہے کہ کسی کو تسبیح میں مشغول کر دیا، کسی کو قیام میں، کسی کو سجود میں علی ھذا القیاس۔ پس ان کی شان تو اجیر (نوکر) کی سی ہے، بخلاف جن وانس کے کہ ان کی عبادت کے ہزاروں طریقے ہیں۔ ایک وقت ان کے لیے نماز پڑھنا عبادت ہے (اور) دوسرے وقت جب تقاضائے بشری ہو اور بدوں اس (تقاضے) کی قضا (پورا) کے نماز میں پریشان رہنے کا احتمال ہو، (سو ایسے وقت میں) پائخانے میں جا کر قضائے حاجت کرنا عبادت ہے۔ (پھر) ایک وقت سونا عبادت ہے۔ پس ان کی شان غلام کی سی ہے؛ اس لیے لِيَعْبُدُونِ میں ان کی تخصیص فرمائی۔

آیت کریمہ کی اس تفسیر کے حوالے سے آگے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ (یہ تشریح) نہ قواعد شرعیہ کے خلاف نہ قواعد عربیہ کے خلاف بلکہ عرف و عادت کے بھی مطابق ہے۔ (کمالات امدادیہ ص ۲۵، ۲۶)

پتہ چلا کہ انسان کا مقصد تخلیق یہی ہے کہ وہ اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ اپنے پروردگار عالم کی اطاعت وفرماں برداری میں گذارے اور ان کی منشاء کے مطابق دن ورات بسر کرے۔ یہاں تک کہ اپنا ارادہ، اپنی ترجیحات اور اپنی خواہشات بلکہ زندگی کے تمام امور میں اپنے اللہ کی مرضی ہی پیش نظر رکھے اور بس!

"تزکیہ واحسان" یا دوسرے الفاظ میں "تصوف وسلوک" کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان نفس کی غلامی سے مکمل طور پر آزاد ہو کر رب کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لے۔ اس کی کُل زندگی اور زندگی کی کُل سانسیں اپنے خالق ومالک اور اپنے آقا ومولا کی اطاعت وفرماں برداری میں گذریں۔ اس کے ہر کام کا مقصود صرف اور

صرف رضائے الٰہی ہو۔

چناں چہ ہمارے اکابر رحمۃ اللہ علیہ کی پاکیزہ زندگی میں ہمیں یہ بات بالکل واضح طور پر نظر آتی ہے۔ تعلیم و تدریس کا مشغلہ ہو کہ تصنیف و تالیف کی مصروفیت، اصلاح و تربیت کا نظام ہو کہ قومی و ملی امور میں شرکت، سیاسی معاملات میں حصہ داری ہو کہ سماجی خدمات کی انجام دہی، وہ جو کچھ بھی کرتے تھے، خدمتِ دین کے پاکیزہ تصور اور اخلاص وللّٰہیت کے زندہ احساس کے ساتھ ان خدمات کو انجام دیتے تھے۔ اس سلسلے میں ذیل میں اکابر علمائے دیوبند کے چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

(۱)

یہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۶/ اکتوبر ۱۸۷۹ء، وفات ۵/ دسمبر ۱۹۵۷ء) ہیں۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید، ان کی فکر کے امین و ترجمان اور پوری دنیا کے لئے ان کے جانشین۔ ان کی پوری حیات طیبہ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں محسوس ہوگا کہ جمود اور تعطل کا ان کی زندگی میں دور دور تک نشان نہیں ہے۔ ۱۳۱۶ھ میں دارالعلوم دیوبند سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد سے لیکر ۱۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ م ۵/ دسمبر ۱۹۵۷ء یعنی اپنی زندگی کے آخری دن تک، ان کی کُل زندگی متنوع خدماتِ دینیہ سے عبارت ہے۔ مسجد نبوی میں حدیث پاک و دیگر علوم و فنون کے یومیہ ۱۵، ۱۵ اسباق کی حسبۃً للہ تقریباً ۱۳/ سالہ تدریس، استخلاص وطن کے لیے اپنے استاذ گرامی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مالٹا کی ۳/ سالہ اسارت، دارالعلوم دیوبند میں ۲۸/ سال تک حدیث پاک کی سب سے صحیح و مستند ترین کتاب "بخاری شریف" کی تدریس، پھر یہ سب اس طرح کہ درمیان میں قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہ کر کبھی راہ سلوک طے کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی شیخ الہند کی محبت میں ہر طرح کی آزادی پر قید و بند کی صعوبتوں کو ترجیح دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر مالٹا سے رہائی کے بعد دن میں اگر مسندِ تدریس پر جلوہ افروز ہیں تو راتوں میں عابد شب بیدار کی تصویر۔ اس کے ساتھ آزادی وطن کے لیے ہونے والی ہر جد و جہد کے فعال رکن۔ آپ کی زندگی کیا تھی؟ جہد و عمل کی ایک تصویر مجسم! قربانیوں اور عزیمتوں کا ایک نادر نمونہ! ابھی کچھ دیر پہلے دیوبند کی دارالحدیث میں اگر یہ دلنواز منظر ہے کہ "بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں" تو معاً بعد دلی میں ملک کے نامور سیاستدانوں کے ساتھ کسی سیاسی مشورے میں شرکت کے لیے پا بہ رکاب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ایک طرف اگر مرشد کامل اور شیخ وقت کا نمونہ دکھائی دیتا ہے، جس کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہو کر ہزاروں نفوس راہ معرفت طئے کر رہے ہوتے ہیں تو دوسری طرف یہ ہستی بذات خود مہمانوں کی خدمت میں مصروف

نظر آتی ہے۔ ان سب کے ساتھ تصنیف و تالیف بھی ہے اور سفر و حضر میں خطوط کے جوابات بھی۔ جی ہاں! اس عظیم شخصیت کا تفصیلی تذکرہ اگر دیکھنا ہو تو "نقشِ حیات"، "تذکرہ شیخ الاسلام"، "علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" اور آپ کی شخصیت پر لکھی گئی دیگر کتابیں دیکھیں، ان کا ہر ورق ہر باب سبق آموز ہے اور ہر ورق چشم کشا!

لیکن۔۔۔! ایک بات قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ حضرت شیخ الاسلام کے اس باعزیمت کردار کے پیچھے آخر مقصد کیا تھا؟ اس سوال کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان کے پیش نظر تھا "خداوندا! مقصودِ من توئی و رضائے تو"۔ اسی کے لیے ان کی تدریس بھی تھی، تصنیف بھی، تبلیغی کاوشیں بھی تھی، اور تزکیہ کی محنتیں بھی، انفرادی اعمال بھی تھے اور اجتماعی، ملی اور قومی کام بھی۔

چناں چہ آپ کے سانحۂ ارتحال پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تعزیتی خطاب میں آپ کے امتیازی اوصاف شمار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "ان کی زندگی کا سب سے پہلا، ممتاز اور اعلیٰ وصف "اخلاص اور للّٰہیت" ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مخلص ہونا انسان کی آخری اور انتہائی تعریف ہے۔ "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" کے مقام پر پہنچنا آسان نہیں ہے، یہ مقامِ نبوت کا پرتو ہے، میں نے مولانا کی زندگی میں اس گوہر کو بہت نمایاں دیکھا، ایسا کام جو اخلاص ہی پر مبنی ہو اور جو عام طور پر محض اللہ ہی کے لیے کیا جاتا ہو، اور جس میں کوئی دنیاوی اور مادی نفع نہ ہو، مثلاً نماز پڑھنا، اس میں اخلاص کا قائم رکھنا زیادہ مشکل نہیں، (اگرچہ یہ بات بھی بہت مشکل ہے اور خال خال افراد ہی کو نصیب ہوتی ہے)؛ لیکن جو کام اکثر و بیشتر بلکہ تمام تر دنیاوی نفع اور فائدہ کے لیے کیے جاتے ہوں، جہاں غیر مخلصین کا مجمع ہو وہاں اخلاص کا قائم رکھنا بڑا مشکل ہے، نماز اخلاص کے ساتھ پڑھنا آسان ہے، لیکن تجارت، مزدوری، کتابوں کا لکھنا اور شائع کرنا اخلاص کے ساتھ بہت مشکل کام ہے۔۔ (چنانچہ ارشاد ربانی ہے:) "رِجَالٌ لَّا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ" (سورۃ النور، آیت: ۳۷)

"مولانا کی بڑائی کا راز یہ ہے کہ وہ سرتاپا اخلاص تھے، وہ اپنے ہر کام میں اور ہر وقت مخلص تھے، ان کا ادنیٰ سے ادنیٰ اور معمولی سے معمولی اور غیر دینی سے غیر دینی کام (بھی) اخلاص کے ساتھ ہوتا تھا، ان کی ساری سیاسی جدوجہد محض "ابتغاء رضوان اللہ" تھی، وہ صرف اس لیے اس میں منہمک رہے کہ وہ اس کو رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے، (اور) وہ اس سے قربِ الٰہی چاہتے تھے، (اور) وہ ان کے لیے "سلوک" بن گیا تھا"۔۔۔ جس نیت سے وہ رات کو تہجد پڑھتے تھے، آپ یقین کریں کہ اسی نیت سے وہ اسٹیج پر تقریر کرتے تھے،۔۔۔ یہ مقام وہ ہے جو صرف اہل اللہ کو بھی نہیں، کاملین اولیاء اللہ ہی کو حاصل ہوسکتا ہے، ایک منٹ کے لیے اپنے کو ایسے

ماحول میں اللہ کے قریب سمجھنا مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ وہاں انہوں نے گھنٹوں، دنوں، مہینوں اور سالوں اپنے کو اللہ کے ساتھ مشغول رکھا، اس کی علامت یہ ہے کہ ان کو ان کی یہ سیاسی مشغولیت ان کیفیات سے دور نہیں کرتی تھیں، جو اس سے علیحدہ ہوتی تھیں۔ جس اسٹیج پر وہ ہوتے تھے وہاں اکثر وہ لوگ بھی ہوتے تھے، جنہیں نماز کا بالکل خیال بھی نہیں ہوتا تھا اور بعض اوقات اکثریت غیر مسلموں کی ہوتی تھی، لیکن وہ جلسہ سے اٹھ کر کسی مسجد میں تشریف لے جاتے، وہاں اگر نماز ہو چکی ہے، (تو) کسی دوسری مسجد میں تشریف لے جاتے، جہاں جماعت ملتی وہاں پڑھتے، کہیں نہ ملتی تو اپنی علیحدہ جماعت کرتے، یہ ایک مثال ہے، اس طرح کے سیکڑوں واقعات ہیں جو ان کی زندگی میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے اخلاص وللّٰہیت اور اللہ کے ساتھ انتہائی تعلق اور مشغولیت کی دلیل ہیں۔ (حضرت حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، صفحہ ۲۳ تا ۲۶ مخلصاً)

شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی وہ جذبۂ اخلاص، بے لوث اور بے غرض کردار اور خدا طلبی ورضائے الٰہی کی سچی نیت تھی کہ ان کے کاموں کو بے پناہ قبولیت عامہ نصیب ہوئی۔ "آپ کی ۸۱/ سالہ عمر میں سے ۲۰/ سال تعلیم وتحصیل کے، تقریباً ۷/ سال ۹/ ماہ استخلاص وطن کے سلسلے میں اسیری کے، اور کم از کم ۱۰/ سال بھی خواب وخور اور دیگر حوائج بشریہ کی تکمیل کے نکالے جائیں تو کارکردگی کی کل مدت ۴۳/ سال رہ جاتی ہے۔ لیکن اس ۴۳/ سالہ مدت میں مدینۃ الرسول عَلٰی صَاحِبِہَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ، کلکتہ اور آسام کے علاوہ صرف دار العلوم دیوبند میں چار ہزار سے زائد وہ تلامذہ ہیں، جنہوں نے آپ کے شمع علم سے اکتساب نور کیا، پھر وہ فیض یافتگان بھی ایسے ہوئے کہ انہوں نے اپنے استاذ کی علمی، عملی، تبلیغی، تصنیفی، ملی اور سماجی خدمات کی پاکیزہ روایت کے تسلسل کو پوری محنت اور جانفشانی سے جاری رکھا، گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدمات دینیہ میں ان سب کی مساعی جمیلہ بھی درحقیقت حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی عالی ہستی سے انتساب اور استفادہ کی برکت اور فیضان ہے، اسی کے ساتھ لاکھوں سے زیادہ وہ طالبین حق ہیں، جنہوں نے تربیت گاہِ مدنی سے تصحیح عقائد، تحسین اخلاق اور تزکیۂ باطن کا درس لیا، جن میں ۱۵۰/ سے اوپر خوش بخت نفوس ہیں، جو احسان وسلوک کی منزلیں طے کر کے سندِ اجازت وخلافت سے مشرف ہوئے، پھر تصنیفات اور مکتوبات کے ہزاروں صفحات، خلق خدا کو خدا شناس بنانے کے لئے دیے گئے لاتعداد خطبات وبیانات اس کے علاوہ ہیں"۔ بلاشبہ حضرت مدنیؒ کے کاموں کی اس قبولیت کا راز، ان کے بے پناہ اخلاص اور رضا جوئی رب کے سوا کچھ نہیں۔

بات بے شک کچھ طویل ہوگئی، لیکن کیا کیجیے کہ اس مخلص اور بے لوث ہستی کی زندگی کا ہر ورق اخلاص و للّٰہیت کا ایک نیا باب ہے۔

لیجیے حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص اور بے لوثی سے متعلق دو واقعات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید شیخ الحدیث، امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بے لوث ذوقِ تدریس کے بارے میں اکثر اپنے طلبہ کو یہ واقعہ سناتے کہ "حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ انگریز کے دور میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے، چنانچہ ایک مرتبہ دورانِ اسارت مراد آباد جیل میں حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبندان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت قاری صاحب کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مدنی جیل میں قیدیوں کو تعلیم الاسلام پڑھا رہے ہیں۔ حضرت قاری صاحب نے از راہِ دل لگی اور مزاح کہا، حضرت آپ نے تو خوب ترقی کی ہے کہ بخاری شریف پڑھاتے پڑھاتے تعلیم الاسلام پڑھانی شروع کر دی ہے۔ حضرت مدنی نے جواب دیا، بھائی! کام جو پڑھانا ہوا، دارالعلوم دیوبند میں بخاری و ترمذی پڑھنے والے تھے، ان کو بخاری و ترمذی پڑھاتا تھا اور یہاں مراد آباد جیل میں تعلیم الاسلام پڑھنے والے ہیں، چنانچہ ان کو تعلیم الاسلام پڑھاتا ہوں۔"

(ماہنامہ الشریعہ، جلد ۲۰، شمارہ ۱۰۷، صفحہ ۷۷، امام اہلسنت نمبر)

(۲) مفکر اسلام حضرت علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہی اپنی کتاب "پرانے چراغ" میں لکھتے ہیں کہ: "مولانا کو انسانی بلندی کے اعلیٰ معیاروں پر پورا پایا، اخلاص و بے غرضی ان کی زندگی کا جوہر اور ان کے تمام اعمال و مساعی و سرگرمیوں کا محرک تھا،۔۔۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مولانا نے جو سرفروشانہ اور قائدانہ حصہ لیا اور اس راستہ میں انہوں نے جو مصائب اور تکلیفیں برداشت کیں،۔۔۔ (اس میں) کسی مادی منفعت اور ذاتی مصلحت کا تصور اور خطرہ بھی شاید ان کے دل میں نہ آتا ہو، چنانچہ جب ہندوستان آزاد ہو گیا اور ملک میں حکومتِ خود اختیاری قائم ہوئی تو وہ اپنے اصلی کام (درس و تدریس اور تزکیہ و ارشاد) میں ایسے مصروف اور سیاسی جدوجہد کے میدان سے ایسی کنارہ کش ہو گئے، جیسے ان کا کام ختم ہو چکا ہو، صف اول کے قائدین میں میرے خیال میں تنہا وہ ایک شخص تھے، جنہوں نے اپنی پچھلی سیاسی زندگی اور قربانیوں کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ قیمت وصول نہیں کی اور وقت سے فائدہ نہیں اٹھایا، یہاں تک کہ جب ان کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے سب سے بڑا اعزازی خطاب عطا کیا گیا تو انہوں نے اس کے قبول کرنے سے صاف معذرت کر دی۔ اگرچہ ان کی طبعی تواضع و انکسار نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ ان کے اسلاف کرام کے شیوہ و مسلک کے خلاف ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ اپنے دامن اخلاص پر خفیف سے خفیف داغ بھی گوارہ نہیں کر سکتے تھے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے اس فیصلہ نے ایک بار پھر اس حقیقت کا اظہار کر دیا: ع

کہ عنقا را بلند است آشیانہ

نہ صرف سیاسی جدوجہد بلکہ انہوں نے اپنے کسی جوہر، کسی کمال، کسی متاع اور کسی ہنر کی کوئی قیمت نہیں لی، جو لوگ حقیقت سے آشنا اور حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ دیوبند کی تنخواہ (جس کا مولانا اپنے "دنیادار" ہونے کا ثبوت دینے کے لیے بار بار اظہار و اعلان فرماتے تھے) وہ ان کے وسیع مہمان خانہ کے ایک ہفتہ بلکہ شاید نصف ہفتہ کا بھی خرچ نہیں تھی، اور اس کا بڑا حصہ سفروں کی غیر حاضری کی بنا پر کٹ جاتا تھا، اور برائے نام وہ ان کے حصے میں آتی تھی۔ انہوں نے دراصل اپنی پوری زندگی احتساب و اخلاص میں گزاری اور اخفائے حال کے لیے مدرسہ کی تنخواہ (جس سے بدرجہا زائد ان کے شاگردوں کو مل سکتی تھی) کا ایک پردہ ڈال رکھا تھا۔

(پرانے چراغ، جلد ا، صفحہ ۹۵ تا ۹۷)

کوئی تجھ سے کچھ، کوئی کچھ چاہتا ہے
میں تجھ سے ہوں یارب طلبگار تیرا

نہیں اس سے زیادہ مجھے کوئی خواہش
ہر اک شئی سے ہے وصل درکار تیرا

نہیں دونوں عالم سے کچھ مجھ کو مطلب
تو مطلوب، میں ہوں طلب گار تیرا

(۲)

دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتگان میں ایک نام حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اساطین علم و فن کے شاگرد اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مجدد تصوف کے تربیت یافتہ۔ آپ اکابر رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی رہے اور ان ہی کی سرپرستی میں دارالعلوم میں بشمول حدیث پاک کی تدریس، مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھائیں۔ آپ کے خلف الرشید حضرت مفتی رفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بقول: "آپ کی تصانیف کی کل تعداد ۱۶۲ رہے۔ جن میں تفسیر قرآن، حدیث پاک، فقہ وفتاویٰ، عقائد وکلام، معیشت و سیاست، سیرت و تاریخ، اصلاح وارشاد، تعلیم و

تبلیغ، زبان وادب کے ساتھ دیگر متفرقات بھی ہیں۔ تفسیر معارف القرآن ۸ رجلدوں میں ہے، ۵۱۷ر صفحات پر مشتمل، اور صرف فقہ وفتاوی پر تقریباً ۵۹ ر تصانیف ہیں۔" حضرت مفتی شفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۲۵ر جنوری ۱۸۹۷ء، وفات ۶ر اکتوبر ۱۹۷۶ء) اس دورِ آخر میں، حکیم الاسلام حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بقول: "مسلک دیوبند کے عظیم داعی اور ترجمان تھے، دارالعلوم دیوبند کے ایک قیمتی جوہر اور عظیم فرد تھے، اور اپنی ذاتی خوبیوں اور لیاقتوں کی بناء پر سارے ہی طبقۂ اہل علم کے معتمد اور مسلّم تھے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اسلاف کا ذوق ان میں پوری طرح رچا بسا تھا۔" (البلاغ مفتی اعظم نمبر صفحہ ۳۰)

حضرت مفتی صاحب کی شخصیت سے تفصیلی آگاہی، آپ کے کارناموں اور مزاج و مذاق سے واقفیت کے لئے" حیات مفتی اعظم" (مؤلفہ: حضرت مفتی رفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ)، "میرے والد میرے شیخ اور ان کا مزاج و مذاق" (از: حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ) اور" ماہنامہ البلاغ کے مفتی اعظم نمبر" کا مطالعہ بے حد مفید رہے گا۔

یہاں مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا مختصر تعارف کے بعد زیر عنوان مضمون کی مناسبت سے آپ کی چند باتیں پیش ہیں، جن کا مطالعہ ان شاء اللہ بصیرت افروز ہونے کے ساتھ ساتھ اس سبق کو بھی تازہ کرے گا کہ" ہر کام میں رضائے الٰہی کو مقدم رکھنا چاہیے" اور پھر یہ بھی کہ" رضائے الٰہی کا حصول اصول شرع کے مطابق کام کرنے پر ہی موقوف ہے۔"

آپ نے جب تقسیمِ ملک کے وقت ہجرت فرمائی اور اس ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کی بات آئی تو حکومت کی طرف سے اسلامی دستور کی ترتیب کے لئے ایک" اسلامی مشاورتی بورڈ" بنایا گیا، جس کے حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ بھی رکن رکین تھے۔

چناں چہ آپ کے صاحبزادے مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیات مفتی اعظم میں لکھتے ہیں کہ: "اس بورڈ کے ممبران کو ایک ہزار روپے ماہوار اعزازی الاؤنس ملتا تھا، جسے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس شرط کے ساتھ قبول فرمایا تھا کہ وہ پابندیاں قبول نہ کریں گے جو سرکاری ملازمین کی ہوتی ہیں۔ یہ پیش بندی اس لیے فرمائی تھی کہ کلمہ حق کے اظہار میں ادنیٰ رکاوٹ پیش نہ آئے۔

چنانچہ ایک موقع پر جب اس بورڈ کی سفارشات کو بالکلیہ نظر انداز کر کے خالص مغربی طرز کے دستور کا مسودہ حکومت نے شائع کیا اور دو مرکزی وزیروں نے اپنے اخباری بیان میں اس مسودہ کو" بالکل اسلامی" قرار دیا تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بعض ارکان نے ایک مشترکہ بیان شائع کیا جس میں واضح کیا گیا کہ اس

مسودۂ دستور کو ہماری سفارشات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور جن وزیروں نے اسے اسلامی قرار دیا تھا بیان میں ان کی بھی خبر لی گئی۔

اس وقت جو صاحب اسمبلی کے سیکریٹری تھے، انہوں نے کسی زمانہ میں ہندوستان میں والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ دن عربی زبان سیکھی تھی۔ تعلقات میں قدرے بے تکلفی کے باعث انہوں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ کو حکومت کے اندر رہتے ہوئے ایسا بیان جاری کرنا مناسب نہ تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''جب سے میں نے بورڈ کی رکنیت قبول کی تھی اسی دن سے جیب میں استعفا لیے پھرتا ہوں اور وجہ یہ ہے کہ آپ کو تو اپنے سوٹ کی شان وشوکت برقرار رکھنے کے لیے سرکاری تنخواہ کی ضرورت ہے، میرے سر سے لے کر پاؤں تک کا لباس صرف بیس روپے میں بن جاتا ہے اس لیے مجھے ایک ہزار روپے کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ میں آئندہ بھی جب جو بات مناسب سمجھوں گا بلا دھڑک دوٹوک شائع کروں گا ورنہ میرا استعفا اربابِ حل و عقد تک پہنچا دیا جائے۔" (اس پر) سیکریٹری صاحب نے معذرت کی اور آئندہ کسی کو ایسے اعتراض کی جرأت نہ ہوئی۔" (حیات مفتی اعظم صفحہ ۱۵۸، ۱۵۹)

مذکورہ واقعہ سے جہاں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی "حمیت دینی"، "غیرت اسلامی"، "جرأت و بیباکی" اور "استغنائی مزاج" معلوم ہوتا ہے، وہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مفتی صاحب ہر کام کو محض رضائے الٰہی کی خاطر کیا کرتے تھے۔ چناں چہ جب انہوں نے دیکھا کہ "غیر اسلامی دستور" کو "اسلامی دستور" کا نام دیا جا رہا ہے تو کسی طرح کی مداہنت، مصلحت بینی یا خاموشی کو ترجیح دینے کے بجائے برملا اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ گویا اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

اور

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے اسی للّٰہی مزاج کی ترجمانی کرتے ہوئے آپ کے مزاج شناس صاحبزادے، فقیہِ دوراں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں: ”آپ نے دارالعلوم کراچی قائم فرمایا تو اسے شروع ہی سے ایک خاص مزاج میں ڈھالنے کے لیے غیر معمولی ذہنی اور علمی محنت اٹھائی۔ آپ کی تمام کوشش کا محور یہ تھا کہ یہ ادارہ ان اکابر دیوبند کے اصلی مزاج و مذاق کی تصویر ہو جنھوں نے آخری دور میں صدق و اخلاص، تواضع وللّٰہیت اور توسط و اعتدال کی اہم ترین مثالیں قائم فرمائی ہیں۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ یہ ادارہ نمود و نمائش کے رسمی مظاہروں اور شور و شر سے الگ رہ کر خاموشی سے دین کے مخلص خادم پیدا کرنے میں لگا رہے، یہاں ایسے اللہ والے جمع ہوں، جو اخلاص اور سلامتِ فکر کے ساتھ دین کی صحیح خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں۔“۔۔۔ نیز (اسی جذبہ کے تحت) آپ نے محض طلباء کی تعداد بڑھانے کے لیے کوئی اقدام کبھی نہیں کیا، بلکہ جو اقدام کیا دیانت داری سے یہ دیکھ کر کیا کہ وہ مدرسہ کے مقاصد سے کس حد تک ہم آہنگ ہے؛ اس لیے جن مشہور مدرسین کی شہرت طلباء کے لیے باعثِ کشش ہو سکتی ہے، ان کو جمع کرنے کے لیے کبھی اصولِ معینہ کو قربان نہیں کیا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو استاذ کسی مدرسے میں پڑھا رہا ہے، اسے وہاں پڑھانے کے دوران اپنے مدرسے میں آنے کی دعوت دینا اصول کے خلاف ہے، اوّل تو اس میں ”سَوْمٌ عَلَى سَوْمِ أَخِيهِ“ (ترجمہ: اپنے بھائی کے سودا کرنے پر سودا کرنے) کا گناہ ہے۔ دوسرے ایک مدرسے کو اجاڑ کر دوسرا مدرسہ آباد کرنا دین کی کوئی خدمت نہیں۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ کوئی صاحب اس مدرسے سے الگ ہو گئے ہیں یا الگ ہونے کا ارادہ ہے تو ان سے زیادہ سے زیادہ جو بات فرماتے وہ یہ تھی کہ ”اگر آپ اس مدرسے کو خود چھوڑنے کا فیصلہ کر چکے ہوں تو دارالعلوم حاضر ہے“ (میرے والد، میرے شیخ، صفحہ ۱۶۴، ۱۶۵)

اللہ تعالیٰ پر توکّل، اہل دنیا سے استغناء اور ہر کام میں للّٰہیت ہر مسلمان، بالخصوص خدامِ دین کے لئے نہایت قیمتی متاع ہے۔ اس کے بغیر کہنا چاہیے کہ بڑی سے بڑی خدمت دینی بھی بے روح ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ لکھتے ہیں کہ: ”حضرت والد صاحب (حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے کہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی وصیت کے مطابق جب تک دینی مدارس توکل، استغناء اور للّٰہیت پر کاربند رہیں گے، ان کا کام ان شاء اللہ بابرکت ہوگا، اور اہل علم سے دنیا کو فائدہ پہنچے گا، لیکن جب اہل علم بھی توکل اور استغناء سے محروم ہو جائیں، اور اہل ثروت کی ثروت پر ان کی نگاہ جانے لگے تو ان کی تعلیم و تبلیغ بھی انوار و برکات سے خالی ہو جائے گی۔ (چناں چہ) مذکورہ بالا اصولوں کے بارے میں حضرت والد صاحب نے تمام منتظمین کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ: ”ہم نے دارالعلوم کی شکل میں کوئی دکان نہیں کھولی؛ بلکہ خدمتِ دین کا

ایک ادارہ قائم کیا ہے، جب تک آپ حضرات اس ادارے کو صحیح اصولوں پر اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق چلا سکیں، چلائیں اور اگر خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آجائے کہ اسے صحیح اصولوں پر چلانا ممکن نہ رہے تو میرے نزدیک اسے بند کر دینا بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ اسے غلط اصولوں پر چلایا جائے۔" (حوالۂ بالا، صفحہ ۱۶۶، ۱۶۷)

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بتائے ہوئے درج بالا اصول اور ان کا طرزِ عمل دراصل ان کے اکابر، علمائے دیوبند، کی تعلیمات اور تربیت کا ہی فیض ہے۔

خدمات دینیہ بے شک اہم ہیں اور یہ بھی بات مسلّم ہے کہ دینی خدمات کی توفیق، اللہ تعالیٰ کے فضل اور خصوصی کرم کی علامت ہے؛ لیکن ان خدمات کی عنداللہ قبولیت کے لئے ایک شرط لازمی یہ بھی ہے کہ وہ شریعت کے اصولِ صحیحہ کے مطابق انجام دیے جائیں۔ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی سالوں میں پیش آمدہ ایک واقعہ کا مطالعہ بصیرت افروز ہوگا۔

"یہ بات ہے ۱۳۱۰ھ کی، جب قیامِ دارالعلوم دیوبند کو تقریباً ۲۷/ برس گذر چکے تھے، امام ربّانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے سرپرست تھے، حضرت نانوتوی کے شاگردِ رشید اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اجل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے صدر المدرسین اور نائب صدارت کے عہدے پر شارح ابو داؤد، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری فائز تھے۔ مہتمم دیوبند کے منشی فضل حق صاحب تھے۔

قصبہ دیوبند کے کچھ ذی اثر، باوجاہت اور دنیاوی جاہ و مال کے لحاظ سے نمایاں افراد کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے اور حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ سے اندر ہی اندر پرخاش تھی، وہ چاہتے تھے کہ ان دونوں حضرات کو دارالعلوم سے علیحدہ کر دیا جائے اور اس کے ساتھ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی انہیں ذہنی وفکری مناسبت نہیں تھی۔ اس لئے یہ بھی چاہتے تھے کہ کسی طرح حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی ختم ہوجائے، اپنے ان ناپاک ارادوں کو بروئے کار لانے کے لئے مہتمم دارالعلوم کو وسیلہ بنایا اور ان کے ذریعہ چاہا کہ مجلسِ شوریٰ میں دیوبند کے ان سربرآوردہ افراد کا اضافہ کیا جائے۔ انہیں مدرسہ کی علمی و دینی ترقی سے کوئی مطلب نہیں تھا۔۔۔ چنانچہ دن گذرتے ان کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے یہ خطرہ یقینی بنتا جارہا تھا کہ یہ فتنہ پرداز جماعت مدرسہ پر قابض ہوجائے اور اندیشہ تھا کہ مدرسہ کا مقصد ہی فوت ہوجائے۔ ایسے میں من جانب اللہ ایسے اسباب بنے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طرف اپنے منتسبین (حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ وحضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ) کو تربیتی خطوط لکھ کر بہترین رہنمائی کی، وہیں دوسری طرف نہایت شانِ استغناء سے منشی فضل حق صاحب کو حکم دیا کہ وہ فوراً اپنا

استعفاء پیش کریں۔ منشی فضل حق میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ انکار کرسکیں۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت مولانا منیر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بحکم حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم بنائے گئے اور انہوں نے اس فتنہ کی بیخ کنی کی"۔ (تفصیل کے دیکھیے مولانا رشید احمد گنگوہی، حیات و خدمات، صفحہ ۱۴۰ تا ۱۴۸)

اس پورے واقعہ میں ہمارے زیرِ بحث عنوان سے متعلق سب سے سبق آموز پہلو وہ ہے جس کا تعلق حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک درخواست اور اس پر حضرت قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے جواب سے ہے۔"

وہ درخواست کیا تھی اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر کیا جواب دیا تھا، ذیل میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں: فرماتے ہیں کہ: "جب اہل دیوبند مجلس شوریٰ میں شریک ہونا چاہتے تھے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے منع فرمایا تھا تو اس پر بہت شور تھا اور فتنے کا اندیشہ تھا، تو میں نے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ: حضرت دفعِ شورش کے لیے کیا حرج ہے اگر ایک دو کو مجلس شوریٰ میں لے لیا جائے۔ آخر تعداد تو ہمارے حضرات ہی کی زیادہ رہے گی اور کثرتِ رائے پر فیصلہ ہوتا ہے، تو جواباً مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا کہ نااہل کا ممبر بنانا معصیت ہے، جو سبب ہے ناراضیِ خدا اور رسول کا، اس لیے ہم نااہل کو مدرسہ کا ممبر نہ بنائیں گے۔ چاہے مدرسہ رہے یا نہ رہے، ہم کو رضاءِ الٰہی مقصود ہے مدرسہ مقصود نہیں۔

(ملحوظات جدید ملفوظات ص:۹۴ بحوالہ العلم والعلماء صفحہ ۱۱۸)

ہمارے یہ اکابر، اللہ ان کی قبروں پر کروڑوں بار رحمتیں نازل فرمائے، جن کی طرف ادنی سا انتساب بھی ہمارے لئے بڑی خوش بختی اور سعادت مندی ہے، اپنے ہر قول و عمل میں اصول شرعیہ کے پابند، اپنی ہر خدمتِ دینی میں اخلاص وللّٰہیت کے زندہ احساس سے سرشار، اور اپنے ہر کام میں فقط رضائے الٰہی کے طلبگار تھے۔ بے شک ان کی زندگی، بعد والوں کے لیے ایک بہترین اور لائق تقلید اسوۂ عمل ہے۔ تاہم ۔۔۔ یہ امر نہایت قابل افسوس ہے کہ آج ان اکابر کی نسبتوں کا احترام مفقود، ان کی اعلیٰ قدریں پامال اور ان کی حقیقی تُراث سے محرومی عام ہوتی جارہی ہے۔ یہ بات بالکل بجا ہے کہ آج پہلے سے کئی گنا زیادہ مدارس و مکاتب ہیں، تصنیفات و تالیفات کی بھی بہتات ہے، سماجی وملی، رفاہی وفکری خدمات کی فراوانی ہے؛ لیکن خدمات دینیہ کے ایسے تنوع اور اتنی کثرت کے باوجود یہ بھی بالکل سچ ہے کہ پہلی جیسی اثر انگیزی نہیں۔ نہ ویسے نتائج ہیں اور نہ اس طرح کی کامیابیاں۔

اقبال کا یہ شعر موجودہ منظر نامہ کی کیسی نقاب کشائی کرتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

رہ گئی رسم اذاں، روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی

اور جگر مرادآبادی کا یہ شعر بھی ؎

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سُرورِ عشق نہیں، چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

چناں چہ خدمات دینیہ کے باب میں مساعی تو بے انتہا ہیں؛ لیکن ان میں بہت سی لا حاصل، محنتیں تو بے شمار ہیں؛ لیکن ان میں سے اکثر بے سود، کوششیں تو خوب ہیں؛ لیکن ان میں بہت سی بے نتائج۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ احتسابی جائزہ لیا جائے تو شاید محسوس ہو کہ خدمات دینیہ کے اس وسیع باب میں کہیں ہماری نیتوں میں ریا و شہرت اور نام و نمود کی آمیزش تو نہیں ہوگئی؟ کہیں شریعت کے اصول صحیحہ پر عمل کرنے میں ہم سے کوتاہی تو نہیں ہورہی ہے؟ اس لیے کہ ہمیں یہ بات جان لینی چاہیے کہ تعلیم ہو کہ تدریس، تبلیغ ہو کہ امامت، تصنیف ہو کہ فقہ و فتاوی کی خدمت، سماجی و رفاہی کام ہوں کہ ملی مسائل میں راہبری و رہنمائی کے فرائض، یہ سب گرچہ اہم بھی ہیں اور ان کا وجود لازمی بھی؛ لیکن ان سب کی حیثیت وسائل کی ہے۔ اصل چیز "رضائے الٰہی" ہے۔ لہذا یہ تمام وسائل اسی وقت مؤثر، بابرکت اور عنداللہ مقبول ہوں گے جب کہ رضائے الٰہی کی روح ان میں کارفرما ہو اور اصول صحیحہ کے مطابق خدمات دینیہ کی انجام دہی ہو۔

مآخذ و مراجع:

اس مضمون میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

(۱) کمالات امدادیہ (از: مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ)
(۲) نقش حیات (از: حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ)
(۳) علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (از: مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ)
(۴) سوانح شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (از: مولانا عبدالقیوم حقانی)
(۵) شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (از: حضرت علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ)
(۶) تذکرہ شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (از: مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی)
(۷) حیات شیخ الاسلام (مؤلفہ: مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ)
(۸) مناقب شیخ الاسلام (از: مولانا افضال الٰہی دیوبندی)

(۹) شیخ الاسلام حسین احمد مدنی، حیات اور کارنامے (مرتب: ڈاکٹر رشید الوحیدی)

(۱۰) کلیات امدادیہ (از: حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ)

(۱۱) ماہنامہ البلاغ کا مفتی اعظم نمبر

(۱۲) حیات مفتی اعظم (مؤلفہ: مفتی رفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ)

(۱۳) میرے والد۔ میرے شیخ اور ان کا مزاج و مذاق (مؤلف: حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ)

(۱۴) مولانا رشید احمد گنگوہی، حیات و خدمات (از: مولانا اسیر ادروی)

(۱۵) العلم والعلماء (افادات تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، مرتب: مفتی زید مظاہری صاحب مدظلہ)

(۱۶) کمالات امدادیہ (از: حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ)

(۱۷) (ماہنامہ الشریعہ، جلد: ۲۰، شمارہ ۱۰۷، خصوصی شمارہ بیاد امام اہلسنت)

☆☆☆

تعارفِ کُتُبِ تَصوّف

سلسلہ نمبر (۴)

مہلک روحانی امراض

نام کتاب	:	مہلک روحانی امراض
افادات	:	از محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی قدس سرہ
مرتّب	:	ڈاکٹر شاہد محمود نقشبندی مجددی مدظلہ
تعارف نگار	:	مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی
صفحات	:	۲۶۴

آج کے ترقی یافتہ دور میں انسان کو ہر طرح کی سہولیات میسر ہیں۔ کشادہ و آرام دہ مکانات، تیز رفتار اور راحت بخش سواریاں، قسم قسم کی مزے دار غذائیں، نوع بہ نوع میوہ جات، خوب صورت، دلکش اور جنت نظیر تفریحی مقامات، تعلیم حاصل کرنے کے بے شمار مواقع، آن کی آن میں ہر خطۂ ارضی کے حالات سے آگاہی کی سہولت؛ غرض آج کے انسان کو ایسی ایسی نعمتیں، اتنی سہولتیں اور اس قدر راحتیں حاصل ہیں کہ پچھلے دور میں شاہانِ مملکت اور فرماں روایانِ عصر کو بھی میسر نہ تھیں؛ لیکن اس حقیقت کے ساتھ یہ بھی بالکل بجا ہے کہ آج کا انسان با ایں ہمہ بے سکون ہے۔ اس کا دل غیر مطمئن، اس کی روح بے چین اور اس کا ذہن منتشر ہے۔ سامانِ راحت کی فراوانی اور اسبابِ سہولت کی ایسی بہتات کے باوجود انسان تو انسان، بہت سے مسلمانوں کی بھی مجموعی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ آخر اس پریشان حالی کا سبب کیا ہے؟ غور کیجیے تو اسی نتیجہ پر پہونچیں گے کہ زندگیوں میں گناہ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک زندگیوں میں گناہ رہیں گے، بے سکونی و بے اطمینانی لازماً ہوگی؛ اس لیے کہ گناہ کی حقیقت رب کی نافرمانی ہے اور رب کی نافرمانی کے ساتھ بندے کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے، یہ محال ہے۔

پھر المیہ یہ بھی ہے کہ گناہوں سے بچنے کی جب بات ہوتی ہے اور ان کے ارتکاب پر وعیدیں سنائی جاتی ہیں تو بہت سے مسلمان گناہوں کی معروف اور ظاہری شکلوں کو ہی اس کا مصداق سمجھتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کا ہی نتیجہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ظاہری گناہوں سے بچنا بھی انتہائی لازمی ہے، اور ایسے گناہوں کی فہرست بڑی طویل ہے، جن کی تفصیلات اس عنوان پر لکھی گئی دوسری کتابوں میں موجود ہیں، لیکن گناہوں کی ایک دوسری قسم بھی ہے، جس کو باطنی گناہ کہتے ہیں اور ان سے بچنا بھی اسی طرح ضروری ہے جیسا کہ ظاہری گناہوں سے اجتناب لازمی۔

چناں چہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں حکم فرمایا: وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ
(سورۃ الانعام: ۱۲۰)

ترجمہ: اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی کو بھی۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہری گناہ سے مراد "افعال جوارح" (ظاہری اعضاء سے صادر ہونے والے گناہ) ہیں اور باطنی گناہ سے مراد "افعال قلوب ہیں" (یعنی دل سے صادر ہونے والے گناہ) جیسے کبر، حسد، خود پسندی اور مسلمانوں کے ساتھ بدخواہی (وغیرہ)
(تفسیر کبیر، جلد ۱۳، صفحہ: ۱۷۷)

چناں چہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "اس سے معلوم ہوا کہ گناہ جس طرح جوارح سے ہوتے ہیں، اسی طرح بعضے گناہ قلب سے بھی ہوتے ہیں"۔
(بیان القرآن: جلد ۱، صفحہ ۵۹۱)

قلب سے صادر ہونے والے گناہوں کی بھی ایک لمبی فہرست ہے، جن سے بچنا بہر حال ضروری ہے، اور پھر ان میں بعضے گناہ ایسے بھی ہیں کہ ان کی حیثیت مہلک روحانی امراض کی ہے۔ مشائخِ تصوف فرماتے ہیں کہ جب تک انسان ان مہلک روحانی امراض میں گرفتار رہے گا، اس کو وصول الی اللہ کی نعمت نصیب نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا محبتِ الٰہی کی نعمت پانے اور معرفتِ الٰہی کی دولت حاصل کرنے کے لیے لازم ہے کہ انسان باضابطہ کسی شیخِ کامل کی تربیت میں رہ کر ان مہلک روحانی امراض کا علاج کروائے۔

آج، خدا کا شکر ہے کہ عبادتوں کی کثرت ہے، نوافل کا اہتمام ہے، صدقہ وخیرات کی بہتات ہے اور دیگر نئی نئی خدماتِ دینیہ بھی ہیں، لیکن پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ مسلمان پریشان ہیں۔ ان کی زندگیوں میں کہیں انانیت

کے مظاہرے ہیں تو کہیں کینہ پروری کے مذموم رویے، کہیں حاسدانہ چشمکیں ہیں تو کہیں متکبرانہ روِشیں، کہیں شہوت پرستانہ مزاج ہے تو کہیں حرص و لالچ میں ابتلا۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی سکون سے محروم ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب گناہ ہیں، اور اس کے علاوہ ان کی ایک بنیادی حیثیت روحانی امراض کی بھی ہے۔

تصوف وسلوک کا بنیادی موضوع بھی یہی ہے کہ انسان کا نفس ہر طرح کے رذائل سے پاک ہوجائے، وہ خصائلِ حمیدہ سے آراستہ ہوجائے اور انسان کو اللہ پاک کی سچی محبت نصیب ہوجائے۔ چناں چہ اسی اہمیت کے پیشِ نظر ہمارے حضرت جی (محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا حافظ پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی) قدس سرہ نے سالکین کرام کے درمیان ایک دفعہ دورانِ اعتکاف، مہلک روحانی امراض کو عنوانِ گفتگو بنایا اور حسبِ مزاج سالکین کی بہت تفصیلی رہنمائی کی۔ زیرتذکرہ کتاب حضرت جی قدس سرہ کے انہیں خطبات کی تصنیفی ترتیب ہے۔

چناں چہ کتاب کے بالکل ابتدائی صفحات میں "پیش لفظ" کے زیرعنوان آپ رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

"جسمانی امراض کا صحیح علاج نہ کیا جائے تو انسان قبر کے گڑھے میں پہنچ جاتا ہے اور روحانی امراض کا علاج نہ کیا جائے تو انسان جہنم کے گڑھے میں پہنچ جاتا ہے۔ جسمانی امراض کے علاج کے لیے حکیم اور ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا ہے اور روحانی امراض کے علاج کے لیے کسی مرشد کے پاس آنا پڑتا ہے۔"

پھر آگے لکھتے ہیں:

"عجیب بات ہے کہ آج مادہ پرستی کے دور میں انسان جسمانی امراض کے لیے تو فکرمند ہے لیکن روحانی امراض کی اسے کوئی فکر نہیں۔ جسمانی امراض کے علاج کے لیے وہ اچھا اور تجربہ کار ڈاکٹر تلاش کرتا ہے پھر ڈاکٹر کو اپنے احوال بتاتا ہے، اس کی ہدایات پر عمل کرتا ہے، بیماریوں کا لٹریچر خود بھی پڑھتا رہتا ہے تاکہ Awareness (آگاہی) رہے۔ بیماریوں سے بچنے کے لیے وہ تمام ضروری احتیاطیں بھی اختیار کرتا ہے تاکہ بیماریاں لاحق نہ ہوں۔۔۔ وہ یہ سب کیوں کرتا ہے؟ اس لیے کہ اسے ان بیماریوں کے مہلک ہونے کا پتہ ہے۔ اس کے برعکس، یہ روحانی امراض سے اتنا غافل ہے! کہ اکثر و بیشتر اسے یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ اس کے اندر بھی یہ امراض موجود ہیں۔ وہ مریض جسے اپنے مرض کا ہی پتہ نہ ہو، بہت جلد تباہی کے دہانے پر پہنچ جایا کرتا ہے۔"

"مشائخِ امت نے انسان کے اندر چند ایسے بنیادی امراض کی نشاندہی کی ہے جو اس کے لیے بہت مہلک ہیں۔ مثلاً شہوت، حرص، غصہ، بخل، حسد اور تکبر وغیرہ۔ اگرچہ روحانی امراض اور بھی کئی ہیں لیکن وہ ان کا ہی مرکب ہوتی ہیں یا ان سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ لوساکا افریقہ میں ایک دفعہ دورانِ اعتکاف فقیر نے یہ کوشش کی کہ شرکائے اعتکاف کو ان بیماریوں کے بارے میں فکرمند کیا جائے۔ لہٰذا ان امراض پر روزآنہ بعد از تراویح مستقل

ایک بیان کیا تا کہ ہر بیماری کی حقیقت اور اس کا علاج سمجھ میں آجائے۔ اگرچہ مکمل علاج تو روحانی معالج (شیخ) کے پاس آنے اور اس کے ساتھ رہنے سے ہی ہوتا ہے۔ لیکن بندے کو ان بیماریوں کی فکر لگ جائے تو یہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے کیا بعید ہے کہ وہ ہماری اس فکر کی وجہ سے ہمیں ان بیماریوں سے محفوظ فرما دیں۔"

کتاب میں کل ۲۶۴ رصفحات ہیں اور ۷ ر درج ذیل بنیادی عنوانات پر مشتمل ہیں: (۱) دید قصور، (۲) طمع، حرص اور شہوت، (۳) غصہ، (۴) کینہ، (۵) بخل، (۶) حسد، (۷) تکبر

چناں چہ ہر عنوان کے تحت آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ مبارکہ اور مختلف عبرت ناک واقعات کی روشنی میں ان روحانی امراض پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔ نیز ہر بیماری کی حقیقت، اس کی اقسام، اس کے پائے جانے کے مختلف اسباب و وجوہات اور اس کے نقصانات پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے اخیر میں ان سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک نہیں؛ بل کہ ہر ایک کے متعدد علاج بتائے گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ "سنجیدگی کے ماحول میں اور خود احتسابی کی نیت سے" اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے۔

ذیل میں کتاب کے چند اہم اقتباسات پیش ہیں:

"دید قصور" کے زیرِ عنوان مذکور ہے۔ "یہ ایک اصطلاح ہے جو حضرت امامِ ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں پہلی مرتبہ استعمال فرمائی۔ "دیدِ قصور" کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نظر اپنے عیبوں پر رہے۔۔۔ اس ٹرم کے الفاظ سے ہی مقصد کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ بڑا اہم عنوان ہے، اس لیے کہ اس میں انسان کی اصلاح کا دارومدار ہے۔"

"ہمارے مشائخ نے یہ بات لکھی کہ جب اللہ رب العزت کسی بندے سے راضی ہوتے ہیں تو اس کے عیوب اس کی نظر میں واضح فرما دیتے ہیں، اور جب اللہ تعالیٰ کسی سے ناراض ہوتے ہیں، اس کے عیوب اس کی نظروں سے چھپا دیتے ہیں۔ (چناں چہ) عیب ہوتے ہیں، (لیکن) اس کو پتہ نہیں چلتا کہ میں کوئی گناہ بھی کر رہا ہوں۔ شیطان انسان کے عملوں کو ایسے مزین کر دیتا ہے کہ بندہ اپنے تانبے کو بھی اپنا سونا سمجھتا ہے، اپنے کھوٹے کو بھی کھرا سمجھ رہا ہوتا ہے تو یہ بہت اہم عنوان ہے کہ انسان کی نظر اپنے عیبوں پر پڑے۔"

"آج گردنیں تنی رہتی ہیں، آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ انسان دوسروں کے چہرے دیکھتا پھرتا ہے اور ان کے عیب گنتا پھرتا ہے۔ اے کاش! یہ گردن جھک جاتی (اور) یہ آنکھیں بند ہوتیں۔ یہ نگاہیں اپنے سینے پر پڑتیں کہ میرے اپنے اندر کیا عیب چھپے ہوئے ہیں۔" (صفحہ ۲۲، ۲۳)

اسی عنوان کے تحت ایک جگہ مذکور ہے:

”اپنے عیبوں پر نظر ہونا، یہ اولیاء کی صفت ہے۔(اور) دوسروں کے عیبوں پر نظر ہونا، یہ فساق کی عادت ہے۔اور آج پہلی عادت ہمارے اندر نہیں، دوسری عادت زیادہ ہے۔“(صفحہ:۲۶)

آگے ارشاد فرماتے ہیں:

”اس لیے ہمارے اکابرین فرماتے تھے کہ خود کو ایسے ظاہر کرو جیسے ہو، یا پھر ویسے بن جاؤ جیسے اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہو۔دورنگی تو ختم ہونی چاہیے۔“ (صفحہ ۲۸)

آگے عیب پہچاننے کے چار طریقے مذکور ہیں: (۱) صحبتِ شیخ، (۲) نیک دوستوں سے اصلاح کروانا (۳) اپنے دشمنوں سے اصلاح (۴) دوسروں سے عبرت پکڑنا۔

”صحبتِ شیخ“ کے زیرِ عنوان درج ذیل تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔فرماتے ہیں کہ:

”اس میں سے ایک طریقہ کسی شیخِ کامل کی صحبت میں رہنا ہے، یہ جو شیخ کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، یہ اصلاح کا تعلق ہوتا ہے، کوئی شعبدے اور کرامتیں دیکھنے کا تعلق نہیں ہوتا۔سالک اپنے آپ کو اصلاح کے لیے پیش کرتا ہے اور شیخ پھر اس کو پیار محبت سے اور کبھی ڈانٹ کر غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے اور یہی نہیں بلکہ ان غلطیوں سے جان چھڑانے کے طریقے بھی بتاتا ہے۔یہ نہیں کہ نقاد ہوتا ہے کہ غلطیوں پر تنقید کر دی (اور) بات ختم نہیں۔اسے لے کر چلنا ہوتا ہے، پھر سمجھاتا بھی ہے کہ اس برائی سے ایسے جان بچائیں اور اس کو ایسے چھوڑیں، اور پھر ان کے لیے تہجد کی نماز میں دعائیں بھی کرتا ہے۔کہتا ہے، اے اللہ! ان گناہوں سے اس کو محفوظ فرما لیجیے، نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ اخلاص سے مانگی ہوئی وہ دعائیں انسان کے کام آتی ہیں، اللہ تعالیٰ اصلاح کا راستہ ہموار فرما دیتے ہیں۔یہ مشائخ کی دعائیں بڑی کام آتی ہیں۔“(صفحہ ۲۹)

آگے مہلک روحانی امراض (طمع، حرص اور شہوت، غصہ، کینہ، بخل، حسد اور تکبر) پر تفصیلات ہیں۔

مذکورہ بالا امراض میں سے کتاب کے مشمولات کا انداز سمجھنے کے لیے بطور نمونہ ہر ایک مرض کے بارے میں چیدہ چیدہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

”شہوت“ کے تعلق سے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”شہوت وہ شیرینی ہے، جو اپنے چکھنے والے کو ڈس لیا کرتی ہے، جو اس لائن پر چلا اس کا نتیجہ بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے مشائخ نے فرمایا: شہوت کے کیڑے کو ابتدا میں مار ڈالو، اس کا مارنا آسان ہے، اگر نہیں مارو گے، یہ کیڑا اژدہا بن کر ایک دن تمہارے گلے میں کنڈلی ڈالے گا۔جو اس راستے پر چل پڑا، اس کا واپس آنا

پھر بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔"

پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"شہوت کی کوئی حد نہیں: جیسے کھانے پینے کی کوئی حد نہیں، شہوت کی بھی کوئی حد نہیں، جتنا اس کو استعمال کریں گے یہ بڑھتی جائے گی، تسلی کبھی نہیں ہوگی۔ جس طرح پیٹو آدمی کو دس روٹیاں کھا کر بھی بھوک لگی رہتی ہے، اسی طرح شہوت کے تقاضے کو بھی انسان جتنی دفعہ پورا کرے، اس کو پھر بھی اپنے اندر اس کی بھوک محسوس ہوگی۔ اس کا تعلق انسان کی عادت کے ساتھ ہے۔ جیسے ایک روٹی کی عادت بنا لے انسان اس پر خوش ہوتا ہے۔ دو کی عادت بنا لے اس پر خوش۔ اسی طرح انسان کی شہوت کا تعلق ہے۔ جو معمول انسان اپنی طبیعت پر بنا لے، طبیعت اسی پر سیٹ ہو جاتی ہے؛ لہٰذا نیکوکار لوگ اعتدال کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور بدکار لوگ اپنی شہوت کی قوت کو ضرورت سے زیادہ استعمال کر کے جوانی کے اندر بوڑھے ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی لیے عقل مند لوگ اس جذبے کو اعتدال میں رکھتے ہیں۔" (صفحہ: ۸۰، ۸۱)

پھر فرماتے ہیں کہ:

"بہت سے نوجوان شہوت ختم کرنے کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ بندے کو رغبت ہی نہ رہے، عورت دیوار کی مانند بن جائے۔ اس کا نام شہوت کا ختم کرنا نہیں۔ اگر عورت دیوار کی مانند ہو جائے تو پھر اس کو اس پر اجر کیا ملے گا؟ اجر تب ملتا ہے جب انسان اس تقاضے کو دباتا ہے۔ تو شہوت ختم کرنے سے مراد یہ ہے کہ شہوت کا بے جا تقاضا ختم ہو جائے۔ اور جو دائرۂ شریعت کے اندر ہے، اس طریقے سے انسان اپنے تقاضے کو پورا کر کے مطمئن ہو جائے۔" (صفحہ: ۸۱، ۸۲)

آگے "سوچ اور شہوت کا تعلق" کے زیرِ عنوان مذکور ہے کہ:

"اس شہوت کا تعلق پچھتر فی صد انسان کی سوچ اور دماغ کے ساتھ ہے۔ یہ ایک تحقیقی بات ہے۔۔۔ میڈیکل سائنس نے آج اس کو ثابت کر دیا ہے، یہ ایک ثابت شدہ چیز ہے کہ شہوت کا پچھتر فی صد تعلق انسان کی سوچ سے ہے۔ چناں چہ اگر کوئی بندہ ایسا ہو جس پر ہر وقت شہوانی، شیطانی خیال غالب رہتا ہو، اس کی طبیعت کے اندر ہر وقت ایک ہیجان ہو، فرسٹریشن ہو، تو ڈاکٹر لوگ اس کے دماغ کا علاج کرتے ہیں۔ اس کو جو گولی دیتے ہیں، وہ اس کے دماغ کو پرسکون کرنے کی ہوتی ہے۔ اس کے جسم کے جو اعضاءِ شہوت ہیں ان کے ساتھ اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔" (صفحہ: ۸۲، ۸۳)

پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ:

’’اب جب میڈیکل سائنس نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ شہوانی سوچوں کے غالب آنے کا تعلق دماغ کے ساتھ ہے، اس کا علاج کرنا چاہیے۔تو ہمارے حضرات نے بہت سال پہلے اس بات کو یوں کہا کہ ”فکر کی گندگی ذکر سے دور ہوا کرتی ہے“ چند لفظوں کے اندر کتنی بڑی حقیقت کھول دی۔ انہوں نے کہا یہ جو ہر وقت شیطانی سوچیں ہیں یہ دراصل فکر کی گندی ہے۔تو فرمایا: ’فکر کی گندگی ذکر کی کثرت سے دور ہوتی ہے۔“(صفحہ:۸۳)

آگے شہوت پر قابو پانے کے لیے ضروری احتیاطیں کے زیرِ عنوان تفصیل سے مختلف طریقے مذکور ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) فارغ (بے کار) نہ رہیں، (۲) تنہائی میں نہ رہیں (۳) بغیر نیند آئے بستر پر نہ جائیں (۴) بیت الخلاء میں ضرورت سے زیادہ وقت نہ لگائیں (۵) فحش مذاق سے بچیں (۶) کبھی کبھی اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے جلتی آگ کی طرف اشارہ کر کے خود کو مخاطب کر کے کہیں کہ اگر گناہ کریں گے تو جہنم کی آگ میں جلنا پڑے گا۔(۷) علاج بذریعۂ مراقبہ۔پھر مراقبہ کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ

’’ذکر کی نورانیت شہوت کی حیوانیت کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے، (چنانچہ) سلسلۂ نقشبندیہ میں لطیفۂ قلب کا مراقبہ اس بیماری کا بہترین علاج ہے۔‘‘(خلاصہ صفحہ:۹۶ تا ۹۸)

دوسرا مہلک روحانی مرض غصہ ہے۔جس کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

’’چونکہ یہ غصہ ایسا ہے کہ انسان کا گھر برباد کر دیتا ہے، انسان دائرۂ شریعت سے خارج ہو جاتا ہے۔اس لیے اس غصے کا علاج کرنا شریعت نے فرض قرار دیا ہے تاکہ یہ دائرۂ شریعت کے اندر رہے۔غصے میں بندے کا دماغ آؤٹ نہیں ہونا چاہیے، اس کی عقل پر پردہ نہیں پڑنا چاہیے۔‘‘(صفحہ ۱۰۸)

آگے غصے کے اسباب بالتفصیل مذکور ہیں، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے: (۱) انا، (۲) عجب یعنی خود پسندی، (۳) غصہ، (۴) تنقید، (۵) حرص، (۶) حسد (صفحہ:۱۰۹)

پھر غصّے کی علامات اور اس کے مختلف علاج بتائے گئے ہیں۔جن کا خلاصہ بطور مثال ذیل میں مذکور ہے۔

غصے کی علامات (خلاصہ):

(۱) پہلی علامت یہ کہ بندہ دوسرے بندے سے بات چیت ختم کر دیتا ہے، نہ سلام، نہ کلام، نہ پیام۔

(۲) دوسری علامت یہ ہے کہ جس پر غصہ ہے اس کی طرف یا تو دیکھتا ہی نہیں، اور اگر دیکھتا ہے تو تیوریاں چڑھا کے دیکھتا ہے۔

(۳) تیسری علامت یہ ہے کہ جس پر غصہ ہوتا ہے، اس کی غیبت کرتا ہے۔

(۴) چوتھی علامت یہ ہے کہ جس پر غصہ ہوتا ہے اس کے راز کو فاش کرتا ہے۔

(۵) ایک علامت یہ ہے کہ اس کے سلسلے میں دل میں کینہ رکھتا ہے، اس کا مذاق اڑاتا ہے، اس سے تعلق توڑ لیتا ہے وغیرہ۔

(۶) اسی طرح ایک نشانی یہ ہے کہ غصے میں ہاتھ اٹھانا، لڑنا اور مارنا شروع کر دیتا ہے۔ (صفحہ: ۱۱۰، ۱۱۱)

غصے کے مختلف علاج:

(۱) چپ ہو جائے
(۲) جگہ بدل لے
(۳) اگر کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے
(۴) پانی پی لے یا پانی سے وضو کر لے
(۵) تعوذ (أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ) پڑھے
(۶) نبی علیہ السلام نے امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو جو دعا سکھلائی تھی، وہ پڑھ لے۔ دعا یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ! اِغْفِرْ لِي ذَنْبِي وَأَذْهِبْ غَيْظَ قَلْبِي، وَأَجِرْنِي مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ مَا أَحْيَيْتَنَا

ترجمہ: اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رب! میرے گناہ بخش دے، میرے دل کا غصہ دور فرما، اور مجھے گمراہ کرنے والے فتنوں سے اپنی پناہ میں رکھ۔

(۷) ایک آخری علاج یہ ہے کہ غصے کے وقت اللہ ربّ العزت کے جلال کے بارے میں سوچے کہ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر مجھے اتنا غصہ آتا ہے تو اگر میرے عملوں پر قیامت کے دن اللہ ربّ العزت کو غصہ آ گیا تو میرا کیا بنے گا۔ (صفحہ: ۱۱۱ تا ۱۱۴)

چناں چہ بے جا غصے کی مذمت بیان کرتے ہوئے آگے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

”بے جا غصہ کرنا، یہ جانوروں کی عادت ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ کتا بے جا غصہ کرنے میں بڑا مشہور ہے۔ چناں چہ کوئی بندہ آرام سے اپنے راستے پر جا رہا ہو گا (اور) یہ اٹھ کر بھونکنا شروع کر دے گا“۔ (صفحہ: ۱۱۹)

کینہ:

روحانی امراض میں سے ایک ”کینہ“ بھی ہے، جس کے معنی ہیں: کسی انسان کے بارے میں دل میں میل، دشمنی یا بغض رکھا جائے“۔

اس بیماری کے تعلق سے فرماتے ہیں کہ:

”یہ کینہ کی بیماری بہت کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی“

(صفحہ: ۱۳۷)

کینہ کی کچھ علامتیں:

مشائخ نے کینہ پرور آدمی کی چند نشانیاں بتائی ہیں۔

چناں چہ کسی شخص کے سلسلے میں جب دل میں کینہ ہوتا ہے، تو کینہ پرور عموماً اس کے حوالے سے درج ذیل امور میں مبتلا رہتا ہے:

(۱) اس شخص کے عیب ڈھونڈنا
(۲) اس کو مصیبت میں دیکھ کر خوش ہونا
(۳) اس سے کلمۂ خیر کو روک لینا
(۴) اس کو حقیر سمجھنا
(۵) اس کے راز افشا کرنا
(۶) اس کا مذاق اڑانا
(۷) اس کو تکلیف پہنچانا
(۸) اس کے عیوب بیان کرنا۔(۱۳۹ تا ۱۴۴ اجمالاً)

کینہ کا علاج:

اگر ہم نیت کریں گے کہ اپنے دل سے کینہ کو دور کرنا ہے تو اللہ پاک اس کی توفیق عطا فرما دیں گے۔ یہ نیت پر منحصر ہے۔(صفحہ:۱۴۵ مخلصاً)

آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

’’کچھ لوگ طہارت خانے سے پاک ہو کر باہر آتے ہیں اور کچھ لوگ بیت اللہ میں جا کر بھی ناپاک رہتے ہیں، یہ تو اپنے اوپر منحصر ہے کہ نیت کیا ہے؟ یہ جو ہوتا ہے نا انتقام لینا کہ ہم تو اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے، یہ بہت بری بات ہے۔ مؤمن ایسا نہیں کرتا، مؤمن میں معافی کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ نبی علیہ السلام نے بہت پیاری بات ارشاد فرمائی کہ تم اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ اب بتائیں کہ اگر ہم سے کوئی غلطی ہو جائے تو کیا ہم چاہتے ہیں کہ لوگ اس غلطی کو بھول جائیں اور ہمیں معاف کر دیں یا ہم چاہتے ہیں کہ لوگ اس کو یاد رکھیں اور اپنے دلوں میں نفرت پیدا کریں۔ تو جو ہم اپنے بارے میں چاہتے ہیں وہی ہم دوسروں کے بارے میں چاہا کریں۔‘‘(صفحہ:۱۴۵،۱۴۶)

بخل:

ایک بڑا خطرناک اور مہلک روحانی مرض ’’بخل‘‘ ہے۔ چناں چہ بخل کی علامت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

’’یہ بخل کیا ہوتا ہے؟ شریعت نے کہا کہ جس بندے کو اپنا مال بیوی بچوں پر خرچ کرتے ہوئے مشکل محسوس ہو، یا اللہ پاک کے راستے میں زکوۃ دیتے ہوئے مشکل محسوس ہو تو یہ بخالت کی دلیل ہے۔‘‘(صفحہ:۱۷۹)

ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”ذہن میں رکھنا کہ مال آتا ہے تو وبال بھی آتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دنیا جادوگرنی ہے۔۔۔ یہ ایسی جادوگرنی ہے کہ جب اس کا جادو چل جاتا ہے تو یہ بندے اور اس کے پروردگار کے درمیان جدائی ڈال دیتی ہے اور جو بندہ اپنے پروردگار سے دور ہٹ گیا، یہ ایسا نقصان ہے کہ جس کا کوئی متبادل نہیں۔

لِكُلِّ شَيْءٍ إِذَا فَارَقْتَهُ عِوَضٌ
وَلَيْسَ لِلّٰهِ إِنْ فَارَقْتَهُ عِوَضٌ

(ترجمہ) اے دوست! تو کسی چیز سے بھی جدا ہو تو تیرے لیے کوئی نہ کوئی بدل موجود ہے لیکن اللہ سے تو جدا ہو گیا تو تیرے لیے اس کا کوئی بدل موجود نہیں۔

اس لیے ہمارے بزرگوں نے ایک بات کہی، فرمایا۔

حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ

(دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے)“ (صفحہ:۱۶۷)

چناں چہ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

”حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ عوام الناس کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کی بہت بڑی کرامت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور انہیں دریا سے محفوظ نکال کر لے گئے۔ مگر اہلِ علم کے نزدیک یہ اتنی بڑی کرامت نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ اہلِ علم کے نزدیک ان کی بڑی کرامت یہ ہے کہ جب فتوحات کا سلسلہ چلا اور اللہ پاک نے ان کے سامنے سونے چاندی کے دریا بہا دیے، وہ اس سونے چاندی کے دریا سے اپنے ایمان کی کشتی کو سلامت بچا کر نکل گئے۔“ (صفحہ:۱۶۶، ۱۶۷)

اللہ تعالیٰ کسی کو اگر مال و دولت کے نعمت سے نوازیں تو بندہ کو چاہیے کہ عاجزی اختیار کرے اور اس نعمت کا ”مرضیاتِ الٰہی“ کے مطابق استعمال کرے۔ لیکن کبھی بندہ ”شکر“ ادا کرنے کے بجائے ”غرور“ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا اندازِ زندگی بھی بدل جاتا ہے۔

حضرت جی قدس سرہ اس کی منظر کشی کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: ”اللہ رب العزت جس کو یہ نعمت دے اس کو چاہیے کہ اپنے آپ کو اس (کے مضر اثرات) سے بچا کر رکھے۔ کہیں یہ سانپ ڈس نہ لے، محتاط رہے۔ کیسے ڈستا ہے مال؟ مال ایسے ڈستا ہے کہ بندے کی آواز میں پھر مال کی جھنکار شامل ہو جاتی ہے۔ کہتا ہے ”او تو مجھے جانتا نہیں“ ہے۔ جب یہ کہتا ہے ناں ”تو مجھے جانتا نہیں ہے“ اب زہر ساتھ شامل ہو گیا جس نے اس کو

متکبر بنا دیا، یہ بڑی مصیبت ہے۔ چناں چہ بڑا بول بندہ بول بیٹھتا ہے۔اور یاد رکھنا کہ بڑا بول بندے کے برباد ہونے کا سبب بنتا ہے۔کبھی بھی بڑا بول نہیں بولنا چاہیے۔ جتنا مرضی اللہ رب العزت انسان کو مال دے دے۔ بندے کی زبان سے کبھی بھی بڑا بول نہیں نکلنا چاہیے۔اور عاجزی اختیار کرنی چاہیے کہ اللہ! تیرے میرے اوپر کتنے احسانات ہیں۔تو میری اوقات سے زیادہ مجھے عطا فرما رہا ہے۔لیکن کئی دفعہ گردن جھکتی نہیں کہیں۔(اس میں) میں آجاتی ہے۔اللہ اکبر کبیرا۔پھر انسان نقصان اٹھاتا ہے۔"(صفحہ:۱۷۴)

مال کے سلسلے میں حضرت جی قدس سرہ کا درجہ ذیل نکتہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"یاد رکھیں! کچھ لوگ مالدار ہوتے ہیں اور کچھ مال کے چوکیدار ہوتے ہیں۔ مالدار تو وہ ہوا کہ جس کو اللہ نے دیا بھی خوب اور وہ اللہ کے راستے میں خرچ بھی خوب کر رہا ہے۔اللہ کی رضا کے لیے دائیں ہاتھ سے خرچ کرتا ہے، بائیں ہاتھ کو پتہ نہیں چلنے دیتا۔ یہ اپنی آخرت بنا رہا ہے اور چوکیدار وہ ہوا جو صبح اٹھ کے بینک سٹیٹمنٹ دیکھتا ہے، اب اکاؤنٹ میں اتنا، فلاں جگہ اتنا، اور فلاں جگہ پیسہ موجود ہے۔ یہ حقیقت میں مال کا چوکیدار ہے۔ یہ بندہ کچھ سالوں کے بعد یہاں سے چلا جائے گا، اولاد اس مال پر عیاشی کرے گی اور باپ کو قیامت کے دن اس کا حساب دینا پڑے گا۔"

آگے فرماتے ہیں کہ:

"اس لیے اللہ کے راستے میں خوب خرچ کریں۔ نبی علیہ السلام نے قسم کھا کر فرمایا جو بندہ اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس صدقہ کی وجہ سے اس کے مال کو کم نہیں ہونے دیتے۔ مال ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے صدقہ کی وجہ سے۔" (صفحہ:۱۸۶)

بخل کے علاج کے سلسلے میں یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

فرماتے ہیں کہ:

"اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بندے میں بخل کی بیماری ہے تو کیا کرنا چاہیے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا ایک ہی حل ہے۔(وہ یہ کہ) اپنے دل پر جبر کر کے اپنے مال کو اللہ کے لیے خرچ کرو! جب خرچ کرنے لگ جاؤ گے، پھر دل بھی اس میں دلچسپی لینا شروع کر دے گا۔(صفحہ:۱۸۳)

مہلک روحانی بیماریوں میں سے ایک "حسد" بھی ہے۔ یہ اتنی خطرناک بیماری ہے کہ نبی علیہ السلام کو اللہ ربّ العزت کی طرف سے حکم ہوا کہ "ہر حسد کرنے والے کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہیں۔ چناں چہ حضرت جی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حسد ایسا گناہ ہے کہ جو عرش (انسان کے دنیا میں بھیجے جانے سے پہلے فرشتوں

کی دنیا میں) پر بھی سب سے پہلے ہوا اور فرش پر بھی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: صفحہ: ۱۹۳، ۱۹۴)

حضرت جی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"جتنا کمال بڑا ہوتا ہے، اتنا حاسد کا حسد زیادہ ہوتا ہے۔ چوں کہ نبی علیہ السلام جیسا کمال کسی کو نہیں ملا، اس لیے ان کے مخالفین جیسا حسد بھی کسی نے نہیں کیا۔۔۔ اللہ ربّ العزت نے اپنے محبوب کی مدد فرمائی اور بالآخر حق غالب آیا۔ یہود کو شروع سے جو حسد پیدا ہوا یہ آج تک امت مسلمہ کے ساتھ چلتے آ رہا ہے۔" (صفحہ: ۲۰۰)

اور آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''جس کو بھی نبی علیہ السلام کی وراثت سے حصہ ملے گا، اس کو حسد برداشت کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ دستور یہ ہے کہ جو وارث ہوتا ہے، اس کو مورث کی ہر چیز میں سے حصہ ملتا ہے۔۔۔ معلوم ہوا کہ جو نبی علیہ السلام کے کامل وارث ہوں گے، ان کو ایسی عداوتوں اور دشمنیوں کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر ان کو وہی خلق اپنانا چاہیے جو نبی علیہ السلام نے اپنایا۔ (صفحہ: ۲۰۰)

آگے ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''جتنی تکلیف میں حاسد ہوتا ہے، اتنی تکلیف میں دنیا میں اور کوئی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ لوگوں کو بیماری میں تو گولی کھا کے آرام آجائے گا۔ کسی کو پیٹ میں درد ہے، کسی کو سر میں درد ہے، کسی کو کمر میں درد ہے تو گولی کھائی اور دو گھنٹے کے بعد آرام آ گیا۔ یہ حسد کے درد کا کیا کریں؟ اس کا کوئی علاج نہیں بی ہر وقت کا درد اور ہر وقت کا دکھ بندے کے دل میں، (لہٰذا) جتنی تکلیف میں حاسد ہوتا ہے اتنا تکلیف میں کوئی نہیں ہوتا۔''

پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''ایک بنیادی اصول سمجھ لیجیے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو اس نعمت کی قدردانی کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ نعمتیں عطا کرتا ہے۔ نعمت کی جو بھی قدردانی کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو بھی اجر عطا کرے گا۔ جو بھی نعمت کی قدردانی کرے گا، اس پر اس کو اجر ملے گا۔ تو جب اللہ تعالیٰ نے کسی کو نعمت عطا کی تو جس بندے نے اس کی قدر کی وہ بھی اجر کا مستحق بنا۔ شیطان دل میں حسد اس لیے ڈالتا ہے کہ یہ اس نعمت کی ناقدری کرے اور نعمت کی قدر کے اجر سے محروم ہو جائے۔ ایک تو بندہ نعمت سے محروم کہ نعمت نہیں ملی۔ اور دوسرا جس کو نعمت ملی اس کی قدردانی کے اجر سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔''

پھر اگلے صفحات میں حسد کی وجوہات اور اس کے نقصانات کا تفصیلی بیان ہے اور اس کے بعد اس کا علاج مذکور ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں (صفحہ: ۲۱۵ تا ۲۲۰)

اخیر میں روحانی بیماریوں میں سے سب سے خطرناک بیماری بلکہ انتہائی مہلک بیماری بی تکبر کا بیان ہے اور بہت تفصیلی۔تقریباً ۴۳ صفحات پر مشتمل۔جس میں تکبر کی مذمت پر آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ مبارکہ ہیں، پھر تکبر کی اقسام، اس کی علامتیں اور اسباب ذکر کیے گئے ہیں اور واقعات کی روشنی میں اس مرض کی خطرنا کی بیان کی گئی ہے۔اور پھر حضرت جی قدس سرہ نے اس کے علاج بھی ذکر فرمائے ہیں۔

اس سلسلے میں بھی چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔فرماتے ہیں کہ:

”حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت اقدس مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے۔ بڑے عالم تھے۔تو انہوں نے ایک بات پوچھی کہ حضرت تصوف کا حاصل کیا ہے۔تصوف کا Object یعنی مقصود کیا ہے۔تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ”تصوف کا مقصود اپنے کو مٹا دینا ہے، (سبحان اللہ!) چند لفظوں میں بات کو سمیٹ کر رکھ دیا کہ اپنے کو مٹا دینے کا دوسرا نام تصوف ہے۔ چناں چہ ہمارے اکابر اپنے تمام نیک اعمال کے باوجود اپنے آپ کو سب سے کم سمجھتے تھے۔ (حضرت) جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر کوئی بندہ اعلان کروائے کہ اس شہر میں سے جو سب سے بدکار ہے وہ نکل جائے (تو) فرمانے لگے (کہ) مجھ سے پہلے اس شہر سے کوئی باہر نہیں نکلے گا، یوں اپنے آپ کو سمجھتے تھے۔اسی لیے تو اللہ پاک نے ان کو ولایت کی دنیا کا جنید بنا دیا تھا۔“ (صفحہ:۲۵۴)

آگے تکبّر کے علاج کے سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”تکبّر کے دو علاج ہیں، ایک علمی اور ایک عملی۔

علمی علاج تو یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنی اوقات یاد کروائے اور قرآن مجید میں یہی اصول بتایا گیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ، خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ (سورۃ الطارق:۵،۶)

ترجمہ: ”دیکھ اے انسان کہ تو کس چیز سے پیدا ہوا، اچھلتے ہوئے پانی سے“ تو پروردگارِ عالم اس طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ دیکھ اے انسان! تو کس چیز سے پیدا ہوا، تو انسان سوچے کہ میں تو ناپاک قطرے سے پیدا ہوا ہوں۔“ (صفحہ:۲۵۴)

پھر آگے تکبّر کا عملی علاج بیان فرماتے ہیں کہ:

”جس انسان کو محسوس ہو کہ میرے اندر تکبّر ہے وہ علانیہ تواضع والے کام کرے، تکلفاً کرے تاکہ اس کی میں ٹوٹے۔مثلاً علماء کے جوتے اٹھائے، (اس سے) تکبّر نکل جاتا ہے۔۔۔(اسی طرح) وہ اپنے ماں باپ کے جوتے اٹھائے، ماں باپ کے جوتے تو قسمت والے ہی اٹھاتے ہیں۔آج کے دور میں ماں باپ کے جوتے

اٹھانے والے بہت تھوڑے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے حالاں کہ یہ ایک عظیم نعمت ہے۔خوش نصیب ہیں وہ نوجوان جو اپنے ماں باپ کے جوتے اٹھائیں۔ آپ خود سوچیے کہ ماں نے جب ہم چھوٹے تھے، سینکڑوں مرتبہ اپنے ہاتھوں سے ہمیں جوتے پہنائے۔ ہم نے بڑے ہو کر کبھی ماں جوتے پہننے لگی ہو تو جوتے سیدھے کیے؟ ہم نے کبھی نہیں کیے الا ماشاء اللہ۔ کبھی والد کے جوتے سیدھے کر دیے ہوں، کوئی قسمت والا ہوگا جو کرے گا۔ بہرحال استاد کے، شیخ کے، علماء کے، جوتوں کو سیدھا کرنا، یہ تکبر ٹوٹنے کے لیے تیر بہدف علاج کے مانند ہے۔تو تکلفاً ایسا کرے۔

نبی علیہ السلام بہت تواضع کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔ چناں چہ آپ کھانا کھانے بیٹھتے تو بڑے تواضع کے ساتھ اور آپ فرماتے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور میں ایک غلام کی طرح کھانا کھاتا ہوں۔

۔۔۔(اسی طرح ایک) دوسرا کام یہ کہ گھر کے کام کرنے میں آدمی عار محسوس نہ کرے۔ گھر کے کام کرنے کو ترجیح دے، (اس سے) تکبر ٹوٹنا آسان ہو جاتا ہے۔ ذرا کبھی چیزیں خرید کر سر پر اٹھا کر گھر پر لے کر آئیں پھر اپنے محسوسات دیکھیں۔ (تلخیص صفحہ: ۲۶۰، ۲۶۱)

مذکورہ بالا سطور اور اقتباسات کتاب کے تعارف، اور اس کا اسلوب سمجھنے میں آسانی کی غرض سے پیش کیے گئے ہیں۔ ورنہ پوری کتاب اس اہمیت کی حامل ہے کہ حرف بہ حرف پڑھی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ہر موڑ پر اپنا جائزہ بھی لیا جائے۔ اس لیے کہ ظاہری بیماریوں کی طرح روح کی بیماریوں سے خصوصاً مہلک روحانی امراض سے ہم سب کا محفوظ رہنا از حد ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ ہمیں روح مزکی اور قلب مجلّی عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

خُطوط ہائے راہِ مَعرفت

درسِ قصدُ السبیل

(قسط نمبر ۵)

ہدایت پنجم: شریعت وطریقت ایک ہی چیز ہے

اس پانچویں ہدایت میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: شریعت وطریقت ایک ہی چیز ہے
اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ سلوک حق تعالیٰ شانہ کے احکام بجالانے اور اس کی نافرمانیوں سے بچنے اور اس میں کامیابی کے لیے اسے یادرکھنے اور ذکر کرتے رہنے کا نام ہے، جب کہ سلوک کا ثمرہ رضائے الٰہی کا حصول ہے، نیز اسی کو تصوف وطریقت بھی کہتے ہیں۔

تشریح:

تزکیہ اور احسان کی وادیوں میں قدم رکھنے والے سالکینِ راہِ حق پر یہ راز مخفی نہیں کہ ایمان کا کمال ظاہر و باطن کی یکسوئی میں پنہاں ہے۔ بندگی محض چند ظاہری رسوم یا بے روح حرکات کا مجموعہ نہیں، بلکہ یہ دل کی دھڑکنوں کو رضائے الٰہی کے تابع کرنے کا نام ہے۔ جب تک شریعت کا نور طریقت کے شیشے سے نہ چھنے، تب تک عمل میں وہ اخلاص پیدا نہیں ہوتا جو بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت پاسکے۔ سلف صالحین اور مشائخِ عظام کا ہمیشہ سے یہ متفقہ فیصلہ رہا ہے کہ شریعت کے بغیر طریقت زندقہ (گمراہی) ہے اور طریقت کے بغیر شریعت محض ایک بے جان ڈھانچہ۔ نفس وشیطان کی مکاری وعیاری اور چال بازیوں سے بچنے اور بندگی کا حقیقی لطف پانے کے لیے ان دونوں کا اجتماع لازم ہے۔ اسی حقیقت کو سمجھاتے ہوئے حضرت امامِ ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''طریقت خادمہ ہے اور شریعت مخدومہ۔''

اہلِ بصیرت پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ دونوں اصول دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں جنہیں الگ کرنا روح کو جسم سے جدا کرنے کے مترادف ہے۔

شریعت وطریقت کا تلازم:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب بات یہ ہے تو لوگوں کا یہ کہنا کہ "شریعت اور چیز ہے طریقت اور" بالکل غلط، خلافِ واقعہ بات اور کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ اگر کسی معتبر شیخ کی باتوں سے یا مستند کتاب کی عبارت سے اس کا شبہ ہوتا ہے تو اس کی حقیقت یہ سمجھ لینی چاہیے کہ دو چیزوں کا الگ الگ ہونا دو طرح ہو سکتا ہے، ایک یہ کہ حقیقت کے اعتبار سے الگ الگ ہوں جیسے ایمان اور کفر؛ کیوں کہ دونوں الگ الگ حقیقتوں کے نام ہیں اور ایک دوسرے کے بالکل برخلاف ہیں، مثلاً ایمان میں تو توحیدِ خداوندی لازم ہے اور کفر میں شرک جائز ہے، پس دونوں کی حقیقت ایک دوسرے کے بالکل خلاف ہے، سو اس معنیٰ میں شریعت وطریقت میں تفریق قطعاً باطل اور سخت گمراہی ہے؛ دوسرے یہ کہ دو چیزیں عدد کے اعتبار سے مختلف ہوں مثلاً کسی فقہ کی کتاب کے بارے میں یہ کہنا کہ کتاب الصلوٰۃ اور کتاب ہے اور کتاب الزکوٰۃ اور کتاب ہے تو یہ عنوانات کا اختلاف ہے حقیقت کا نہیں، کیوں کہ کتاب الصلوٰۃ میں جس چیز کو ناجائز وحرام کہا گیا ہو کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کتاب الزکوٰۃ یا کسی اور کتاب میں اس کو حلال وجائز کہہ دیا جائے، پس یہ ایک ہی حقیقت کے اجزاء یا عنوانات کا فرق ہے، چناں چہ اگر کسی مستند کلام میں شریعت اور طریقت کو الگ الگ بتانا سمجھ میں آتا ہے تو وہ اس دوسرے معنیٰ کے اعتبار سے سمجھا جائے گا۔

تشریح:

سلوک دراصل حق تعالیٰ شانہ کے احکامات کی بجا آوری، منہیات سے اجتناب، اور اسی کی یاد میں گم ہو جانے کا نام ہے۔ اسی کا ثمرہ رضائے الٰہی اور معرفتِ خداوندی ہے، اور اسی کو اہلِ علم تصوف، طریقت، پیری مریدی اور بیعت سے تعبیر کرتے ہیں۔

چناں چہ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شریعت کا راستہ الگ ہے اور طریقت کی راہ گزر جدا، وہ کھلی گمراہی اور جہالت میں مبتلا ہیں۔ ان کی مثال اس نادان جیسی ہے جو یہ کہے کہ نماز الگ ہے اور وضو الگ!

شریعت اگر نماز ہے، تو طریقت اس کا وضو ہے۔

اور اگر کوئی شخص شریعت اور طریقت کو اس ملکوتیت یا جہالت کے ساتھ الگ سمجھتا ہے کہ صاحبِ طریقت کو شریعت کی اور صاحبِ شریعت کو طریقت کی ضرورت نہیں، جیسا کہ دورِ حاضر کے بعض نام نہاد صوفی جو شریعت کا

مذاق اڑاتے ہیں، نماز سے دور بھاگتے ہیں اور محض ''ھوحق'' کے نعروں کو تصوف سمجھتے ہیں، تو یہ سراسر گمراہی ہے۔ یہ نہ طریقت ہے، نہ تصوف۔ کیوں کہ صاحبِ طریقت شریعت سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

لیکن، اگر کوئی شخص اس اعتبار سے ان میں فرق کرتا ہے کہ شریعت ظاہر (مقصود) کا نام ہے اور طریقت باطن (وسیلہ) کا، جس طرح وضو بظاہر ایک آزاد عمل ہے مگر اس کا وجود نماز تک پہنچنے کے لیے لازم ہے، تو یہ تفریق قابلِ اعتراض نہیں۔ چونکہ بغیر وضو کے نماز ممکن نہیں ہے، اسی لیے طریقت پر زور دیا جاتا ہے تاکہ شریعت کی روح بیدار ہوسکے۔ مگر اعتدال کی بات یہی ہے کہ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں، وہ اس طرح کہ

مقصودِ طریقت بھی اللہ ہے۔

مقصودِ شریعت بھی اللہ ہے۔

اگر تفریق صرف تفہیم، تحریر یا گفتگو کی حد تک ہو تو درست ہے، لیکن اگر ان کے وجود کو الگ کر دیا جائے تو بندہ نفاق کے اندھیروں میں گر جاتا ہے، جس میں انسان کا ظاہر کچھ اور، جب کہ باطن کچھ اور ہوتا ہے۔

طریقت اور شریعت دراصل ظاہر و باطن کو یکساں کرنے کا نام ہے۔ جیسا کہ شاعر نے اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ؎

بن جائے یہ سب قال مرا حال سراسر
جو کچھ ہے زباں پر، ہو خدایا مرے دل میں

یہی یکسانیت معتبر اور مطلوب ہے، اس کے برعکس ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ ہونا نفاق ہے، جو ایک مہلک روحانی بیماری ہے۔ قرآنِ عظیم الشان نے منافقین کی یہ کیفیت بیان فرمائی ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا (سورۃ النساء، آیت: ۱۴۲)

ترجمہ: ”بے شک منافقین اللہ پاک سے چال بازیاں کررہے ہیں اور اللہ پاک خود ان کو چالبازی کی سزا چکھائیں گے۔ اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو نہایت سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، اگر وہ نماز پڑھتے بھی ہیں تو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے پڑھتے ہیں، (اور اس سب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ) وہ اللہ پاک کا ذکر نہیں کرتے مگر بہت کم۔“ (بیان القرآن)

اس نفاق سے بچنے کے لیے ہی طریقت کا دامن تھاما جاتا ہے تاکہ شریعتِ مطہرہ تک رسائی ہو۔ یاد رکھنا چاہیے کہ شریعت مخدومہ تو طریقت اس کی خادمہ۔

جس طرح حضرات فقہاء کرام فقہ کی تعریف کرتے ہیں: ’’مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَمَا عَلَيْهَا‘‘ یعنی نفس کے نفع ونقصان کی حقیقت کو جاننا، اسی طرح عرب علماء کے نزدیک تصوف کی تعریف ’’تَعْمِيْرُ الظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ ‘‘ یعنی ظاہر وباطن کو آباد کرنا ہے۔ یعنی تصوف بھی حقیقت شناسی کا نام ہے۔

جس طرح صرف سطحی طور پر رکعتوں کی تعداد جان لینا فقیہانہ علم نہیں کہلاتا؛ یہی وجہ ہے کہ ایک عام انسان اور ایک راسخ فقیہ کے علم میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک عام مسلمان کی نماز اور ایک اللہ والے کی نماز میں بھی یہی فرق ہوتا ہے۔ ہم نماز صرف سر سے فرض اتارنے کے لیے پڑھتے ہیں، جب کہ اہلِ اللہ نماز میں ڈوب کر پڑھتے ہیں، نہ کہ ان کی نماز کا طریقہ شریعت سے الگ ہوتا ہے؛ کیوں کہ ان کا ظاہر وباطن یکساں ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ ’’طریقت والے دل کی نماز پڑھتے ہیں اور شریعت والے جسم کی‘‘، صریح گمراہی ہے۔

ایک اشکال کا ازالہ:

ایک سوال اکثر ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ اگر طریقت اتنی ہی اہم اور ضروری تھی تو عہدِ رسالت اور دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس کا یہ موجودہ ڈھانچہ اور نام کیوں نہ تھا؟

اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی مجلس کا فیضان اور آپ ﷺ کی نظرِ مبارک کی تاثیر اتنی کامل ومکمل تھی کہ ایک ہی لمحے میں کایا پلٹ جایا کرتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب انوارات میں کمی آئی، تو شریعت کے تحفظ کے لیے تقسیمِ کار ہوئی۔ فقہاء کرام نے شریعت کے ظاہر (احکام) کی ذمہ داری سنبھالی، حضرات مشائخ اور صوفیاء عظام نے شریعت کے باطن (احوال واخلاص) کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے اصول، آداب اور منازل وضع کیے۔

ہم بھی اسی منزل کی طرف رواں دواں ہیں جہاں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہنچے تھے، مگر کیفیات اور پہنچنے کے اسلوب میں فرق ہے۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ مشائخ عظام کی صحبت ہمیں بالکل حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقام پر کھڑا کر دے گی، یہ سراسر غلط ہوگا۔ کیوں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ کی ایک نظر سے جو پاتے تھے، ہمیں اس دور میں مشائخ عظام کے دامن سے وابستہ ہو کر مجاہدوں کے بعد حاصل کرنا پڑتا ہے۔

اگرچہ مشائخِ عظام فرماتے ہیں کہ اگر یہ مقصود بیعت کے بغیر بھی حاصل ہو جائے تو زہے نصیب! مگر عادتِ الٰہیہ (سنت اللہ) یہی رہی ہے کہ کسی شیخِ کامل کی معیت اور اصلاح کے بغیر یہ منزلِ مراد ہاتھ نہیں آتی۔

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (سورۃ الاحزاب، آیت: ۶۲)

ترجمہ: ’’اور آپ اللہ پاک کے طریقے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔‘‘ (بیان القرآن)

حاصل کلام:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ شریعت اور طریقت یا فقہ وتصوّف کے عنوانات اگر ظاہر و باطن کے احکام میں تقسیم کیے جائیں تو دو الگ الگ علم معلوم ہوں گے اور اگر دونوں کو ظاہر و باطن کا جامع قرار دیا جائے تو دونوں ایک ہی چیز ہو جائیں گے، جیسے فقہ کی تعریف مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَا لَهَا وَمَا عَلَيْهَا کی جائے یا تصوف کی تعریف تَعْمِيرُ الظَّاهِرِ وَالْبَاطِنِ تو دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہو جائیں گے؛ بہر حال! شریعت وطریقت میں حقیقی مغائرت ومخالفت کا اعتقاد سخت گمراہی اور بے دینی کی بات ہے۔

تشریح:

ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ خانقاہوں کا اصل مقصد روحِ بلالی اور سوزِ صدیقی کا احیاء ہے، نہ کہ شریعت کے احکام سے فرار۔

حرفِ آخر کے طور پر یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عہدِ رسالت کی کیفیات کو پانے کے لیے مشائخِ عظام کی صحبت اور مجاہدے ایک ناگزیر واسطہ ہیں۔ طریقت دراصل شریعت پر اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کا نام ہے، اور اس راستے میں بیعت و ارادت سنتِ الٰہیہ کے اسی تسلسل کا حصہ ہیں جسے بدلا نہیں جا سکتا۔ چناں چہ ظاہر و باطن کو یکساں کر کے نفاق سے بچنا اور اتقاء کا اعلیٰ مقام حاصل کرنا ہی تصوف کا اصل حاصل ہے۔ جب تک یہ دونوں دھارے ایک ہو کر ہماری زندگیوں میں رواں نہیں ہوں گے، تب تک ہم قال سے حال کی طرف سفر نہیں کر سکیں گے۔ خدا کرے کہ ہماری زبان اور دل ایک ہو جائیں اور ہمارا ظاہر ہمارے باطن کی سچی گواہی دینے والا بن جائے۔

اللہ پاک ہمیں مشائخ عظام اور صوفیائے کاملین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شریعتِ مطہرہ پر استقامت اور طریقتِ حقہ سے سچی وابستگی نصیب فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

ہدایت ششم: استفادے کا صحیح طریقہ

شریعتِ مطہرہ کا مقصود محض ظاہری اعمال کی ادائیگی نہیں بلکہ انسان کے ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ہے۔ چناں چہ جس طرح عقائد، عبادات اور معاملات کی درستی مطلوب ہے، اسی طرح قلب کی تطہیر، اخلاق کی تہذیب اور تعلق مع اللہ کا استحکام بھی مطلوبِ شرع ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو اہلِ علم و مشائخ عظام نے ”تصوف وسلوک“ کے عنوان سے بیان کیا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سلفِ صالحین کے ہاں تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے؛ کیوں کہ قرآنِ عظیم الشان نے فلاح اور کامیابی کو تزکیۂ نفس کے ساتھ وابستہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کے مقاصد میں تعلیمِ کتاب وحکمت کے ساتھ تزکیۂ نفوس کو بھی شمار فرمایا۔ اسی بنا پر اکابرِ امت نے ہر دور میں اس علم کی حفاظت فرمائی اور اس کے اصول وآداب کو مدون کیا تاکہ طالبِ حق راہِ سلوک میں اعتدال اور استقامت کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔

زیرِ نظر ہدایت نامہ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں سلوک کے عملی مراحل، صحبتِ شیخ کی ضرورت، احوالِ باطن کی نگرانی، ذکر ومراقبہ کی حقیقت، وساوس کے علاج اور طریقۂ تربیت کے بنیادی اصولوں کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خصوصاً یہ ہدایت اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ سلوک کی ترقی محض معلومات کے حصول یا ظاہری معمولات کی کثرت سے نہیں، بلکہ اہل اللہ کی صحبت، مداومتِ ذکر، مجاہدۂ نفس اور کامل اتباعِ سنت سے حاصل ہوتی ہے۔

سلوک میں آگے بڑھنا:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چھٹی ہدایت: استفادے کا صحیح طریقہ

جب سلوک کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی اور اس کے ابتدائی درجہ، جو فرضِ عین ہے، کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا اور کسی شیخِ کامل کا صفاتِ مذکورہ کے مطابق انتخاب بھی کرلیا اور بیعت ہونے کے غلط اغراض کو چھوڑ کر صحیح اور سچی غرض بھی متعین کرلی اور اس کا اطمینان بھی ہوگیا کہ شریعت اور طریقت ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، کوئی علاحدہ چیز نہیں ہیں تو اب شیخِ کامل سے باقاعدہ وابستہ ہوکر سلوک کے دوسرے درجے میں قدم رکھے، یعنی ضروری اور لازم دینیات پر عمل اور ظاہری وباطنی گناہوں سے اجتناب کے ساتھ ساتھ نفل اعمال واشغال اور یادِ الٰہی پر دوام واستقامت کے مرتبے تک پہنچنے کی فکر شروع کردے؛

تشریح:

جب سالک پر حقیقتِ سلوک آشکارا ہوجائے، وہ اس کے ابتدائی درجے (جو کہ فرضِ عین ہے) پر گامزن ہوجائے، کسی شیخِ کامل کا انتخاب کرکے فاسد مقاصد کو ترک اور صحیح مقصد کا تعین کرلے، اور اسے یہ کامل اطمینان ہوجائے کہ شریعت اور طریقت دراصل ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں جو باہم پیوست ہیں (کیوں کہ طریقت کے وسیلے ہی سے شریعت کی اصل حقیقت نصیب ہوتی ہے)، تو اب اسے چاہیے کہ کسی شیخِ کامل کی صحبت وزیرِ نگرانی سلوک کے دوسرے یعنی اعلیٰ درجے میں قدم رکھے۔

سلوک کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان فرائض کے ساتھ ساتھ سنن و نوافل سے بھی آراستہ ہو کر آگے بڑھے۔

اب عملی سفر کا آغاز یوں ہونا چاہیے کہ ضروری دینی احکام پر عمل پیرا ہونے اور ظاہری و باطنی گناہوں سے کلی اجتناب کے ساتھ ساتھ، نوافل، اشغال اور یادِ الٰہی پر استقامت کا مرتبہ حاصل کرنے کی فکر دامن گیر ہو۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ: بندہ مقامِ معرفتِ الٰہی تک رسائی حاصل کرنے کی تگ و دو شروع کر دے۔

صحبتِ شیخ کی اہمیت اور اس کی اقل ترین مدت:

فرماتے ہیں کہ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو شیخ کی صحبت و خدمت میں کچھ قابلِ لحاظ مدت تک رہے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو غائبانہ ہی سہی مضبوط رابطہ قائم رکھے، اور جس ذریعے سے بھی ممکن ہو استفادے کا سلسلہ جاری رکھے، حالات کی اطلاع اور ہدایات کی اتباع دیانت اور فکر کے ساتھ جاری رکھے، یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہر شیخ کا طریقۂ تربیت علاحدہ ہوتا ہے اس لیے اپنے شیخ سے ہی رجوع کرتا رہے۔ بس یہ ہے سلوک اور اس کی حقیقت!

تشریح:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقام کیسے حاصل ہوگا اور اس کا طریقہ کیا ہے؟

طریقہ یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو سالک ایک قابلِ لحاظ مدت تک شیخ کی صحبت اور خدمت میں قیام کرے۔

قابلِ لحاظ مدت سے مراد کم از کم وہ وقت ہے جس کو قیام کہا جا سکے۔ صحبت کا اقل ترین درجہ ہر مہینے میں کم از کم تین دن ہے۔ جیسے رمضان المبارک میں اعتکاف کے دس دن ہوتے ہیں، اسی مناسبت سے دس، نو، آٹھ یا سات دن، اور کم سے کم تین دن ہے۔ ہمارے حضرت جی قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ”یہ بھاگتے بھاگتے آنا اور اڑتے اڑتے چلے جانا، نہ تو آنا کہلاتا ہے اور نہ ہی رہنا۔“

ہاں! اگر شدید ترین مجبوری ہو اور لاکھ چاہنے کے باوجود کوئی تین دن نہ دے سکے، تو دو دن، ایک دن یا چند گھنٹے دینا ایک الگ بات ہے (وہ مستثنیٰ ہے)۔

لیکن اگر کوئی شخص بدوں کسی معقول عذر کے یہ تین دن بھی نہیں دے پاتا ہو تو اسے نہ اپنا وقت ضائع کرنا چاہیے اور نہ شیخ کا۔ اور یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ دور بیٹھ کر چاہے جتنے بیانات سن لیں یا خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم کر لیں، صحبتِ شیخ کے بغیر وہ باطنی کیفیت کی بات بن ہی نہیں سکتی۔

تاریخِ تصوف میں ایسے واقعات شاذ و نادر (بطورِ استثنا) ہی ملتے ہیں کہ کسی نے شیخ کو دیکھا نہ ہو اور صرف خط و کتابت سے خلافت یا اجازت مل گئی ہو۔ چونکہ اصل اعتبار کثرت اور عموم کا ہوتا ہے، اس لیے طریقت کا دارو

مدار صحبت پر ہی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ہے کہ: "اگر کوئی شخص ایسی ملازمت یا مجبوری میں جکڑا ہوا ہو کہ مہینے میں ایک مرتبہ بھی شیخ کی خدمت میں حاضری نہ دے سکے، تو میں ایسی روزی کو (سالک کے لیے) ناجائز سمجھتا ہوں۔"

سلوک کے درجات اور صحبت کی فرضیت:

یہاں ایک اہم وضاحت ضروری ہے تاکہ سالک کے لیے کوئی الجھن باقی نہ رہے:

(۱) ادنیٰ درجہ (فرضِ عین):

سلوک کا ابتدائی یا ادنیٰ درجہ فرائض و واجبات کی پابندی، عقائد کی درستی اور باطن کو اچھی صفات سے آراستہ کرنا ہے۔ اس درجے کے لیے شیخ کی مستقل صحبت لازمی نہیں ہے، انسان دور رہ کر بھی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) اعلیٰ درجہ (مقصودِ تصوف):

سلوک کا وہ اعلیٰ مرتبہ جس کے لیے تصوف میں قدم رکھا جاتا ہے، کہ دل ذاکر بن جائے، رگ و پے میں محبتِ الٰہی سما جائے، اور تعلق مع اللہ نصیب ہو، اس کے لیے صحبتِ شیخ فرضِ عین ہے۔

خصوصاً ہمارے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے ذریعہ سے اگر کوئی اللہ تک پہنچنا چاہتا ہے تو صحبت ناگزیر ہے۔ اس سلسلے کے امام، حضرت اقدس خواجہ بہاؤالدین نقشبند بخاری نور اللہ مرقدہ کا فیصلہ ہے: "طریقِ ما صحبت است" یعنی ہمارا طریق سراسر صحبت پر قائم ہے۔

قدیم دور میں لوگ سال سال یا چھ چھ مہینے شیخ کے آستانے پر پڑے رہتے تھے۔ ہمارے اکابر اور اسلاف کے ہاں، جو پہلے سالک بنے اور بعد میں شیخ کے مرتبے پر فائز ہوئے، (ان کے ہاں) یہ بات متفقہ طور پر طے تھی کہ کم از کم چالیس دن (چلہ) ایک ایک سیکنڈ کی پابندی کے ساتھ شیخ کی خدمت میں گزارنا لازم ہے۔ مگر افسوس کہ اس دور میں تین دن کا خیال بھی دلوں سے ختم ہوتا جا رہا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ ملاقات کے لیے آتے ہیں اور خانقاہ کے نگران کو یہ کہہ کر پریشان کرتے ہیں کہ "ہمیں جلدی جانا ہے"۔ اگر جلدی جانا ہی تھا تو آئے ہی کیوں؟

خانقاہ کے اصول و آداب انتہائی نازک ہوتے ہیں، اس لیے یہاں بے جا رعایتیں نہیں دی جاتیں۔ اگر رعایتیں دی جائیں تو اصول و آداب کا جنازہ نکل جائے گا، اور جب آداب ختم ہوں گے تو شیخ کی مشیخت خطرے میں

پڑ جائے گی کہ اس نازک طریق کو کھیل بنادیا گیا۔ اصولوں کی عدمِ پاسداری تصوف کو محض ایک کھیل بنادیتی ہے۔

کیا خط وکتابت صحبت کا بدل ہے؟

بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ ''صحبت ممکن نہ ہو تو غائبانہ خط و کتابت سے کام لیں'' تو یادرکھیے کہ یہ صحبت کا حقیقی بدل ہرگز نہیں ہے۔ ہمارے حضرت جی قدس سرہ فرماتے تھے کہ'' دنیا میں صحبت کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو اس کے سب سے پہلے حقدار سید التابعین حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ ہوتے (جو مصلحتِ وقت کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظاہری صحبت سے محروم رہے)۔ جب انہیں بدل نہیں ملا تو بعد میں کسی کو کیسے مل سکتا ہے؟'' جیسے دنیا میں ماں کا کوئی بدل نہیں، ویسے ہی صحبتِ شیخ کا کوئی متبادل نہیں۔ اور جہاں تک رہی بات یہ کہ مشائخ عظام جو خط و کتابت کو بدل کہتے ہیں، وہ صرف لغوی اعتبار سے ہے، اصطلاحی یا حقیقی اعتبار سے نہیں؛ یعنی محض مجبوری کا ایک حل ہے۔

جیسے کوئی بھوکا شخص کہے کہ کھانے کو کچھ نہیں ہے تو چلو اس کے بدلے پانی ہی دے دو۔ پانی کھانے کا بدل نہیں ہے، مگر انسان مجبوری میں ایسا کہتا ہے۔ بالکل اسی طرح لاکھ کوشش کے باوجود اگر صحبت میسر نہ ہو تو کہا جاتا ہے کہ چلو کچھ نہ ہونے سے خط و کتابت ہی کرلو، مگر اسے حقیقی بدل نہ سمجھا جائے۔

احوالِ باطن کی اطلاع اور اس کا صحیح طریقہ:

راہِ سلوک میں اصلاح وتربیت کے لیے رابطہ اور اطلاعِ احوال نہایت ضروری ہے، پس سالک کو چاہیے کہ دیانت داری اور فکر مندی کے ساتھ اپنے احوال کی اطلاع شیخ کو دیتا رہے اور اس کی ہدایات کی مخلصانہ اتباع کرے۔ حکیم الامت حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب ایک صاحب نے بیعت کرنے میں جلدی کرنی چاہی تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواباً خط لکھا کہ آپ فی الحال قصد السبیل میں سے عالمِ مشغول کا دستور العمل موقع بموقع مطالعہ شروع کردیں اور حالات اور معمولات کی اطلاع دیتے رہیں۔ ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا بیعت کرنے کی (ابھی) جلدی نہیں ہے۔ (تربیت السالک، ج:۱، ص:۱۷۲)

طریقِ سلوک کو طے کرنے کا اصل راستہ یہی ہے کہ اپنے احوال سے شیخ کو باخبر رکھا جائے۔ بعض لوگ خط لکھتے ہیں تو اس میں بیوی بچوں کے احوال، ملکی وسیاسی حالات، یا مسجد کی کمیٹی کے جھگڑے درج کردیتے ہیں اور اپنے بارے میں صرف اتنا لکھتے ہیں کہ ''الحمدللہ میں بہت اچھا ہوں اور یہ یہ نیک کام کرتا ہوں۔'' یہ سراسر اپنے نفس کے ساتھ چوری ہے۔ اپنے عیوب چھپا کر دوسروں کے احوال لکھنا طریقت کے خلاف ہے۔

جیسا کہ ہمارے حضرت جی قدس سرہ فرمایا کرتے تھے: کہ'' اس زمانے میں بیویاں بیعت ہوتی ہیں

شوہروں کی اصلاح کے لیے، اور شوہر بیعت ہوتے ہیں بیویوں کی اصلاح کے لیے۔"

اصل طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنی فکر کی جائے۔ جب آپ خود پاک صاف ہو جائیں اور باطن کا میل ڈھل جائے، تب دوسروں کا سوچیں۔ حضرت جی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ "اپنے برے حالات کی اطلاع پہلے کرو اور اچھے حالات کی بعد میں۔"

عام طور پر سالکین یا تو احوال لکھتے ہی نہیں، یا پھر صرف اپنے اچھے معمولات، تسبیحات اور دعاؤں کی درخواست بھیج دیتے ہیں۔ ارے بھائی! جس مقصد (اصلاحِ نفس) کے لیے بیعت ہوئے تھے، وہ کہاں ہے؟ اندر کبر (غرور) باقی ہے، نفس موٹا ہے، غصہ جلدی آتا ہے، شہوت پرستی، حسد اور بغض جڑ پکڑے ہوئے ہیں، ان کی کوئی فکر نہیں! اور فخر سے لکھا جاتا ہے کہ مراقبہ اتنی دیر ہوا اور تسبیحات کی پابندی ہو رہی ہے۔

ذرا خود سوچیں کہ اگر کسی کو عربی زبان آتی ہو اور وہ ایمان کے بغیر بھی خوبصورت فصیح عربی بولے، تو کیا یہ کوئی کمال ہے؟ ایک شخص نماز کے ظاہری ارکان سیکھ جائے مگر ایمان نہ ہو، تو کیا نماز معتبر ہوگی؟ تسبیحات تو کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔ تسبیحات کی پابندی کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر لیا۔ معمولات کی پابندی سے مراد وہ باطنی سبق (ذکر و مراقبہ) ہے جو شیخ نے آپ کے لیے تجویز کیا ہے۔

اصطلاحاتِ سلوک کی واقفیت اور مراقبے کی اہمیت :

سالکین کو اصطلاحاتِ تصوف سے واقف ہونا چاہیے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ وہ کر کیا رہے ہیں۔ بعض سالکین لکھتے ہیں: ''معمولات تو پابندی سے ہو رہے ہیں، بس مراقبہ نہیں ہو رہا۔'' سبحان اللہ! مراقبہ کیا معمولات سے الگ کوئی چیز ہے؟ معمول واحد ہے اور معمولات اس کی جمع۔ اصل اور بنیادی معمول تو مراقبہ ہی ہے۔

کچھ سالکین مراقبے کی پابندی کا ذکر کرتے ہیں اور تسبیحات کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ چلتے پھرتے ہو جاتی ہیں یا کبھی چھوٹ بھی جاتی ہیں۔ تو یاد رکھیے، اصل فکر مراقبے کی ہونی چاہیے، اس میں کبھی ناغہ نہیں ہونا چاہیے۔

اس بات کو یوں سمجھیں کہ اگر کسی شخص کو بیعت سے پہلے نماز کی عادت نہیں تھی، بیعت کے بعد اسے توفیق ہوئی لیکن پرانی عادت کی وجہ سے کبھی فجر یا عشاء کی نماز چھوٹ گئی، تو ایسے بندے کے لیے بھی یہی ہدایت ہے کہ وہ یہ نہ سوچے کہ ''جب نماز چھوٹ گئی تو مراقبہ کیوں کروں؟'' نماز چھوٹ بھی جائے تب بھی مراقبے کا ناغہ نہ کرے۔ کیوں کہ مراقبے کی یہ پابندی اسے ایک دن نماز کی مستقل پابندی تک لے آئے گی۔

جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشادِ عالی ہے کہ عنقریب اس کی نماز اسے برائیوں سے روک دے گی۔

(مسند احمد، ج:۲، حدیث:۹۷۷۲)

اسی طرح ذکر کا یہ معمول انسان کو نماز تک کھینچ لائے گا۔ قرآن پاک میں ہے: وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ

ترجمہ: "میری یاد کے لیے نماز قائم کرو" (سورہ طٰہٰ، آیت: ۱۴)

نماز کا اصل مقصود اللہ پاک کی یاد ہے۔ جب مراقبے کے ذریعے یادِ الٰہی دل میں جاگزیں ہو جائے گی، تو قدم خود بہ خود نماز کی طرف اٹھیں گے۔ چناں چہ مراقبے کی پابندی کرنے والے کبھی بے نمازی نہیں رہتے، بلکہ تہجد، اشراق، چاشت اور اوابین بھی ان کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں؛ کیوں کہ دل جب یادِ الٰہی سے موجزن ہو جاتا ہے تو اسے نماز کے بغیر چین نہیں آتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یادِ خدا میں اس قدر غرق رہتے تھے کہ نماز کے وقت کا اشتیاق رہتا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرماتے: قُمْ يَا بِلَالُ، فَأَرِحْنَا بِالصَّلَاةِ (سنن ابی داود/ کتاب الادب/ حدیث: ۶۹۸۶)

ترجمہ: "اے بلال! کھڑے ہو جاؤ اور نماز کے ذریعے ہمیں راحت پہنچاؤ۔"

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا میں نماز نہ ہوتی تو عُشاق کے دل عشقِ الٰہی کی تپش سے پھٹ جاتے۔ وہ نماز کے وقت کھڑے ہو کر گویا اپنے عشق کا مصلّٰی بچھاتے ہیں۔ حاجی صاحب رحمہ اللہ کا یہ مقولہ بھی ہے کہ: ''میں قبر میں جا کر کیا کروں گا؟ اللہ پاک سے درخواست کروں گا کہ مجھے وہاں بھی نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ اسی میں لگا رہوں۔''

اور جنّت کے بارے میں بھی فرمایا کہ "اگر اللہ پاک نے اپنے فضل سے جنت عطا فرمائی تو ہمیں وہاں کی نعمتوں سے غرض نہیں، ہم تو یہی کہیں گے کہ ہمیں دو رکعت نماز پڑھنے کی جگہ دے دی جائے۔"

پس، ذکر کا مقصود یہی مقام حاصل کرنا ہے۔

شیخ سے وابستگی اور وساوس کا علاج:

ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سے جڑے رہنا، صحبتوں کا اہتمام کرنا، احوال کی اطلاع دینا اور شیخ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا کتنا ضروری ہے۔ اگر یہ باریکیاں آپ کو نہ بتائی جاتیں، تو آپ یہی سوچتے رہتے کہ ''مثلاً جب نماز ہی چھوٹ گئی تو مراقبے کا کیا فائدہ؟'' مشائخ کی صحبت کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ جہاں تک ہماری نظر نہیں جاتی، وہاں تک ان کی بصیرت پہنچتی ہے۔

ابتدائے سلوک میں بہت سے سالکین کو کفر، شرک اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں گستاخی کے شدید وساوس آتے ہیں اور وہ گھبرا جاتے ہیں۔ ایسے میں شیخ کی ہدایت ہوتی ہے کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں، وساوس کو آنے دو۔ وساوس کا واحد توڑ اور علاج ذکرِ الٰہی ہے۔

چناں چہ راستے میں اسپیڈ بریکر، گڑھے اور خار دار جھاڑیاں آئیں گی، مگر آپ کو چلتے رہنا ہے۔ جوں جوں ذکر بڑھے گا، وساوس دم توڑ دیں گے۔ یہ وساوس محدود ہیں اور ذکرِ الٰہی کی طاقت لامحدود ہے۔

حضرت جی قدس سرہ فرماتے تھے کہ ”گناہ اور طبیعت کے اختلاف کے اعتبار سے کسی کو سو، کسی کو ہزار اور کسی کو پانچ ہزار وساوس آتے ہیں۔ یہ وساوس خود اس بات کی علامت ہیں کہ آپ کتنے گہرے گڑھے میں گرے ہوئے تھے اور اب وہاں سے نکل رہے ہیں۔“ جتنے وساوس زیادہ ہوں گے مراقبہ اتنا ہی بڑھا دینا چاہیے، کیوں کہ بیماری جتنی شدید ہوگی، دوا کی مقدار بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

جس طرح جسمانی امراض کے مریضوں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں:

کچھ مریض معمولی دوا لے کر اپنا کاروبارِ دنیا بھی کرتے رہتے ہیں اور شفایاب ہو جاتے ہیں۔

کچھ مریضوں کو ڈاکٹر مکمل بیڈ ریسٹ (Bed Rest) اور گھر میں رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔

کچھ مریضوں کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر انہیں فوری ہسپتال میں ایڈمٹ (Admit) ہونے کا کہتا ہے، اور بعض کو آئی سی یو (ICU) میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

ایسے ہی روحانی دنیا میں بھی علاج کے ایسے ہی مختلف طریقے ہیں، اور جو طریقہ شیخ آپ کے مرض کے مطابق تجویز کرے، اسی میں آپ کی شفا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہر شیخ کا طریقۂ تربیت جداگانہ ہوتا ہے، اس لیے اپنے ہی شیخ سے رجوع رکھنا چاہیے۔ کوئی شیخ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتا۔ وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے استخارہ کرتا ہے اور جب اللہ پاک کی رضا شاملِ حال ہوتی ہے، تب ہی وہ مصلحت کے تحت کوئی فیصلہ کرتا ہے۔ ہمیں مشائخ پر اعتراض کرنے کے بجائے، آنکھیں بند کر کے ان کی ہدایات پر چلنا سیکھنا چاہیے۔

اور طریقۂ تربیت جدا ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اصول بدل دیے جائیں۔ اصول وارکانِ طریقت میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہمارے سلسلے میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام آخری سند کا ہے۔

ان کے دور تک سلسلہ نقشبندیہ میں کچھ غلط رسوم اور بدعات خلط ملط ہو گئی تھیں۔ حضرت امام ربانیؒ نے اس پر پورا علمی و روحانی کام کیا، اس کی ابتدا سے لے کر عہدِ نبوی ﷺ تک کے سفر کا جائزہ لیا، خرابیوں کی نشان دہی کر کے انہیں سلسلے سے خارج کیا اور سلسلے کو اس کی اصل روح کے ساتھ نکھار کر امت کے سامنے پیش کیا۔ اب وہ ایک فائنل اور آخری کاپی ہے، جس میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

چناں چہ نقشبندی مجددی سلسلے میں ذکرِ جہری (اونچی آواز کا ذکر) اور مراقبے کو خلط ملط کرنا مجددی طرز کے خلاف ہے۔ ہمارے حضرت جی قدس سرہ جو فرماتے تھے کہ ہم ''نقشبندی'' کے ساتھ ساتھ ''مجددی'' بھی ہیں، وہ اسی لیے تاکہ واضح رہے کہ ہمارا طریقہ امام ربانیؒ کے طرزِ عمل کے عین مطابق ہے۔ جو لوگ صرف نقشبندی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر سنت و بدعت میں تمیز نہیں کرتے، ان کا دعویٰ ادھورا ہے۔ امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ کا بدعت کے معاملے میں اتنا سخت موقف تھا کہ فرماتے تھے:

''یقین جانیے کہ بدعتی کی صحبت کا فساد کافر کی صحبت کے فساد سے بھی زیادہ ہے۔'' (مکتوباتِ مجددیہ، دفترِ اول، مکتوب: ۵۴)

لہٰذا بدعت کے ساتھ مجددی ہونے کا دعویٰ باطل ہے۔ نقشبندی مجددی ہونے کا اصل مطلب ہی یہ ہے کہ جہاں بدعت کی دور دور تک کوئی گنجائش نہ ہو اور سنتِ سنیہ کی کامل اتباع ہو۔

یہ چھٹی ہدایت کی تفصیلات تھیں کہ آپ سلوک کا آغاز کریں اور بسم اللہ کہہ کر قدم بڑھائیں۔ اب اس راہ میں آگے کیا مسائل پیش آتے ہیں، ان کا تفصیلی بیان اگلی ہدایت میں آئے گا، ان شاء اللہ۔

اللہ پاک اخلاص اور استقامت کے ساتھ اس راہ میں چلتے رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

☆☆☆

سُلوک کی ڈاک

سلسلہ نمبر (۵)

ہدایۃ السالکین

ضبط وترتیب: مفتی محمد عمران قاسمی کورٹلوی

سوال نمبر (۱):

کبھی نجی یا کاروباری حالات یا دیگر مسائل کی وجہ سے ذہن الجھا رہتا ہے اور ایسی صورت میں مراقبہ کرنے میں بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں کیا کریں؟

جواب: یہ شیطان کی طرف سے ایک چال ہوتی ہے کہ حالات پہلے سدھر جائیں پھر مراقبہ میں بیٹھیں گے۔ یاد رکھیں! یہ دنیا پریشانیوں سے گھری ہوئی ہے۔ "مشائخ نے اس کو دار المحن فرمایا ہے" (یعنی آزمائشوں کا گھر)۔ ہم اگر اس بات کے انتظار میں رہیں کہ پہلے سب حالات موافق ہوجائیں پھر معمولات میں لگیں گے تو ایسا کبھی ہونے والا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ذہن میں رکھیں کہ ہم اللہ پاک کو جتنا یاد کریں گے اتنا ہی اللہ پاک ہمارے مسائل کو حل فرمائیں گے۔

سوال نمبر (۲):

مراقبہ نہیں ہورہا ہے کیا تدبیر اختیار کریں؟

جواب: تدبیر یہی ہے کہ مراقبہ بہرحال کریں، ایک وقت طے کرلیں اور اس وقت کوئی دوسرا کام ہرگز نہ کریں، بس مراقبہ کریں چاہے کچھ ہو، مراقبہ تو شرطِ اولیں ہے، اس کی حیثیت ہمارے سلسلے میں ایسی ہی ہے جیسے انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی۔ لہٰذا مراقبہ لازماً کرنا چاہیے۔

سوال نمبر (۳):

مراقبہ میں جان کیسے پیدا ہوگی؟

جواب: سالک جس قدر اپنے آپ کو گناہوں سے دور رکھے گا اور آداب کی رعایت رکھے گا اسی قدر مراقبہ میں جان پیدا ہوگی۔

سوال نمبر (۴):

دورانِ مراقبہ وضو ٹوٹ جانے پر کیا دوبارہ وضو کریں یا ویسے ہی مراقبہ جاری رکھیں؟

جواب: جو لوگ مراقبہ ابھی ابھی شروع کیے ہیں، ان کے لیے تو بہتر یہی ہے کہ دورانِ مراقبہ وضو ٹوٹ جانے پر بھی مراقبہ میں بیٹھے رہیں؛ اس لیے کہ وضو کے بہانے اٹھیں گے تو ہوسکتا ہے کہ دوبارہ نہ بیٹھ پائیں، ہاں، جو ساتھی مراقبہ کے عادی ہو چکے ہیں، ایسے کہ وضو ٹوٹنے پر دوبارہ وضو کرنے کے لیے اٹھنے کے بعد پھر بیٹھنا مشکل نہ ہو تو ایسوں کے لیے بہتر ہے کہ دوبارہ وضو کر کے بیٹھیں۔

سوال نمبر (۵):

کیا دورانِ مراقبہ چھینکنے والے شخص کا جواب دے سکتے ہیں؟ اسی طرح اگر دورانِ مراقبہ نبی علیہ السلام کا اسمِ گرامی سنائی دے تو کیا درود پاک پڑھ سکتے ہیں؟ اس کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: جواب دینا ضروری نہیں ہے۔ ہاں اگر جواب دینا ہی ہو تو مراقبہ کی حالت میں ہی آنکھ بند کیے ہوئے یَرْحَمُكَ اللہ کہہ دیں کوئی حرج نہیں۔ اسی طریقہ سے مختصر درود (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی آہستہ سے زبان سے پڑھ لیں، کافی ہے۔ اس کے لیے مراقبہ موقوف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سوال نمبر (۶):

اللہ پاک کی نسبت کا نور تمام اسباق کے مکمل ہونے کے بعد ملتا ہے یا اس سے پہلے بھی مل سکتا ہے؟

جواب: اللہ پاک کی نسبت کا نور، خالص اللہ تعالیٰ کا فضل اور ان کی ملک ہے، جو اللہ پاک کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اور کبھی بھی دے سکتے ہیں، اس کے لیے تمام اسباق کا مکمل ہونا شرط نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کوئی سبق نہ کرے اور اللہ پاک اُس کو یوں ہی نورِ نسبت سے نواز دیں، کیوں کہ اللہ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ اللہ کا فضل ہے اللہ جس کو چاہتے ہیں، عطا فرماتے ہیں۔

لیکن اللہ پاک کے یہاں ایک اصول ہے اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ کہ جو اپنی طرف سے اللہ کو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ روتا دھوتا ہے، محنت کرتا ہے، مانگتا ہے، اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو یقیناً اللہ پاک نورِ نسبت کی نعمت سے سرفراز فرماتے ہیں۔

چناں چہ ہمارے مشائخ نے اسی تصوف کے راستے پر چل کر نسبت کا نور حاصل کیا ہے۔ اس لیے ہم بھی

اس راستے کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جیسے علم کی نعمت ہے کہ اللہ پاک جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں، لیکن عام قاعدہ یہ ہے کہ اس کی تحصیل کے لیے مدرسے میں داخلہ لے کر پڑھنا ہوتا ہے۔ ایسے ہی راہِ سلوک کی محنت ہے کہ اس کے اصول وقوانین کے مطابق چلنے سے نورِ نسبت عطا ہوتا ہے۔ اسی لیے ہمارے حضرت جی قدس سرہ فرماتے تھے کہ نسبت کے نور کو تمنا بنا کر مانگا کریں" ہاں ایک بات اور ہے اور انتہائی اہم ہے۔ وہ یہ کہ نورِ نسبت کے حاصل ہونے میں گناہوں سے اجتناب کو بڑا دخل ہے۔ اس لیے ہر قسم کے گناہوں سے بچنا چاہیے۔

سوال نمبر(۷):

ہر سبق کی خصوصیت اور کیفیت کیا ہے، کیسے پتہ چلے گا؟

جواب: اس سے واقفیت کے لیے حضرت جی قدس سرہ کی کتابیں" شجرۂ طیبہ، تصوف وسلوک، زبدۃ السلوک، مقاماتِ عشرہ برائے سلوک، معارف السلوک، مدارج السلوک، معمولاتِ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس میں اسباق کی وضاحت اور ان کی خصوصیات و کیفیات کو حضرت جی نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

سوال نمبر(۸):

بیعت ہونے سے کیا مراد ہے؟ اور اس کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: بیعت ہونے سے مراد یہ ہے کہ سالک اپنے آپ کو شیخ کے حوالے کر دے، یعنی اپنی مرضی کو شیخ کی مرضی کے تابع کر دے۔ جس طرح ایک مریض ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور اس کے نسخے پر عمل کرتا ہے، اسی طرح سالک بھی اپنے باطنی امراض (جیسے تکبر، حسد، ریاکاری وغیرہ) کے علاج کے لیے شیخ کی ہدایات پر عمل کرتا ہے۔

اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سالک کو اللہ پاک کی محبت کا راستہ طے کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے، اس کی اصلاح جلدی ہو جاتی ہے اور وہ گناہوں کے دلدل سے نکل کر اللہ پاک کا مقرب بندہ بن جاتا ہے۔

☆☆☆

اصلاحی و تربیتی منظوم کلام

سلسلہ نمبر (۴)

مناجات

از: حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

صدقِ احساس کی دولت میرے مولیٰ دیدے
غمِ امروز بھلادے ، غمِ فردا دیدے
دُھن کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی
دلِ دیوانہ و سودائی و شیدا دیدے
اپنے میخانہ سے اور دستِ کرم سے اپنے
دونوں ہاتھوں میں مرے ساغر و مینا دیدے
کھول دے میرے لیے علمِ حقیقت کے در
دلِ دانا، دلِ بینا، دلِ شنوا دیدے
قول میں رنگِ عمل بھر کے بنا دے رنگیں
لبِ خاموش بنا کر دلِ گویا دیدے
دلِ بے تاب ملے، دیدۂ پُر آب ملے
تپِ آتش مجھے دیدے، نمِ دریا دیدے
دردِ دل سینے میں رہ رہ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے

(ارمغانِ سلیمانی، صفحہ ۴۴)

بزمِ ہستی سے ہمیں اور تو کیا لینا ہے
ہاں مگر دل کے تڑپنے کا مزا لینا ہے

مدّتوں ٹھوکریں کھائیں تو سمجھ میں آیا
اپنی ہستی کو مٹانا تجھے پا لینا ہے

فاش ان پر بھی نہ ہو رازِ محبّت اے دل
ان سے بھی اپنی محبّت کو چھپا لینا ہے

دل میں اک جذبۂ بے تاب اگر ہے موجود
منزلِ یار کو دو گام میں جا لینا ہے

اپنے سر کو درِ جاناں پہ جھکانا کیفی
اپنی روٹھی ہوئی تقدیر منا لینا ہے

(محمد زکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ)